دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ
معارف
جلد نمبر ۱۸۶ ماہ شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۱۰ء عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

قرآن مجید، پیش گاہ الٰہی سے عطا کیا جانے والا سب سے بڑا معجزہ ہے، اس حقیقت پر ہر صاحب ایمان کا ایمان ہے کہ دیگر انبیائے کرام کو جو معجزے عطا کیے گئے وہ وقتی تھے اسی لیے عارضی تھے، تو ان کا اثر بھی وقتی اور عارضی رہا، قرآن مجید کے قائم و دائم اعجاز کے اسباب روز اول سے بیان کیے جاتے رہے اور عجب بات ہے کہ عملاً کسی نہ کسی شکل میں قرآن کی معجز نمائی ظاہر بھی ہوتی رہی، فصاحت، بلاغت، یکسانی، قوت تاثیر، تعلیم و ہدایت، قوت دلائل جیسے اوصاف ہی ثبوت اعجاز کے لیے کافی ہیں، مزید یہ کہ زمین و آسمان کی کتابوں کی دنیا میں وہ واحد کتاب ہے جس نے اپنا جواب، اپنا ثانی اور اپنا مثل لانے کا اعلان عام کیا، کامل نہیں تو جزءاً اور نہ ایک آیت ہی سہی، نزول قرآن سے اب تک یہ مخاطبین قرآن کے لیے برقرار اور سر تسلیم خم کردینے والوں کے لیے وجہ قرار اور انکار و عناد رکھنے والوں کو بے قرار کیے ہوئے ہے، ایک اُمی کی زبان سے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جانے والی دانائی ''حکمۃ بالغۃ'' کو دل کی گہرائی سے قبول کرنے کی برکت ایک طرف تو یوں ظاہر ہوئی کہ تیئیس[۲۳] برس میں ایک اَن پڑھ اور صحراؤں کی خوگر قوم نے تعلیم و تمدن کی معراج پالی، دنیا کی سب سے کمزور قوم نے دنیا کی دو سب سے طاقت ور حکومتوں کو ختم ہی نہیں کردیا، سرمایہ و استحصال اور جبر و استبداد کے مضبوط ترین قلعوں کو منہدم کرکے سیاست و حکومت کا منہج ہی بدل دیا، مذہبی چیرہ دستیوں پر پہلی بار ضرب کاری لگائی، وہ مذہبی پیشوا اور خود ساختہ محبوب خدا اور فرزند خدا جنہوں نے اپنے ہم مذہبوں کی شفاعت اپنے نام کر رکھی تھی اور اپنے ماننے والوں کے ذہن و دل میں یہ بات راسخ کردی تھی کہ جہنم ہم کو چھو بھی نہیں سکتی، قرآن نے انسانیت کو دام فریب میں لانے اور گرفتار کرنے والی ہر سیاسی، فوجی اور مذہبی طاقت کو طاغوت کہہ کر، انسانیت کی حقیقی نجات اور کامیابی دلانے کی کلید بلکہ شاہ کلید عطا کردی۔

یہی چیلنج، یہی صداقت اور یہی قوت تھی، جس نے عام آدمی کی محنت اور کمائی کا استحصال کرنے والوں اور مذہب کے نام پر سیم و زر کی ہوس پوری کرنے والوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کیا، سرشت میں صلاحیت ہوتی تو کلمۂ حق قبول کرلیا جاتا لیکن جن کی فطرت میں فساد فی الارض ہو وہ

حکمۃ بالغہ کو قبول کیسے کرتی، فما تغنی النذر کی سچائی ظاہر ہونا ہی تھی، انکار و عناد، بغض و فساد، قتل و غارت گری اور حق کو نذر آتش اور خاکستر بنانے کی فطرت پہلے بدلی اور نہ اب تک بدل سکی، جس کی تازہ مثال امریکہ میں سامنے آئی۔

۱۱؍ستمبر وہ تاریخ ہے جب چند برس پہلے امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور کئی عمارتوں کو حملہ آوروں نے برباد و زیر خاک کر دیا، اصل مجرم اب بھی صیغۂ راز میں ہیں لیکن نبیوں اور عدل و انصاف کی آواز بلند کرنے والوں کے قاتلوں کے جانشینوں نے اس فعل کا مرتکب مسلمانوں بلکہ اسلام ہی کو ٹھہرایا لیکن ہر کرب و بلا کے بعد اور زندہ و توانا ہونے کی اسلام کی خاصیت نے بدقسمتوں کی آتش غیظ و غضب کو جس طرح ہوا دی اس کا اظہار فلوریڈا کے ایک پادری ٹیری جونس کے اس اعلان سے ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی قرآن مجید کو جلا کر خاک کر دیں گے، جو آگ صدیوں سے ان پادریوں، راہبوں اور ان کے تابع حکمرانوں کے سینوں میں بھڑک رہی تھی اور جس کا اظہار میدان جنگ میں بھی ہوتا رہا اور قرطاس و قلم کی دنیا میں بھی یہ آگ کبھی سلگتی اور کبھی بھڑکتی رہی، اس کے شعلوں میں قرآن مجید کے جلانے کی خواہش نئی نہیں تھی، لیکن یہ بھی عین قرین عقل ہے کہ ہر صاحب ایمان کے علاوہ ہر ذی فہم کے لیے یہ خبر سخت کرب و اضطراب و وحشت اثر ثابت ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عالم میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی، مذمت کی جانے لگی اور تہذیب و تمدن کے موجودہ تمام نام نہاد دعوے داروں کے اس عمل کو وحشیانہ عمل سے تعبیر کیا جانے لگا، خود امریکی حکومت کو اس قرآن سوزی کے اعلان سے پریشانی کا احساس ہوا اور عام لعنت و ملامت کے خوف اور شاید مذہبی و سیاسی خوف نے حکومت کو مجبور کیا کہ پادری کو اس فعل شنیع سے بزور باز رکھا جائے، اور ہوا بھی یہی کہ نصاری اور یہود کا یہ صہیونی تماشا سنگ ملامت کے خوف سے دید کے قابل نہیں رہا۔

انڈونیشیا سے خود امریکہ تک مسلمانوں نے غم، اضطراب اور غصہ کا مظاہرہ کیا اور بعض جگہوں پر جذبات پر قابو بھی نہیں رہا اور یہ قابل فہم بھی ہے لیکن خود قرآن مجید نے ایسے موقعوں کے لیے جو تعلیم دی ہے وہ جذبات سے زیادہ قیمتی اور کارگر اور اسی لیے وہی لائق عمل ہے، واعرض عن الجاهلين، واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما کے نسخے اثر و فائدہ میں جذبات کی

حدت وحرارت سے کہیں زیادہ نفع بخش ہیں، جذبات کے بے محابہ اظہار سے دشمن کو وقتی طور پر زیر و مرعوب کیا جاسکتا ہے لیکن قرآن مجید اور قرآن والے صرف مرعوب کرنے کے لیے نہیں متاثر کرنے کے لیے ہیں، بدنصیب ہیں وہ جن کو قرآن کا پیام ہدایت و رحمت و شفا نہیں مل سکا، اصل علاج یہی ہے کہ قرآن مجید کے پیام کو اس طرح عام کیا جائے کہ اس کی کرنیں ہر سیہ خانے کو منور کردیں اور ہر ساز سے یہی صدا نکلے کہ ان هـذا القرآن يهدی للتی هی اقوم، یورپ اور امریکہ ہی کیا پوری دنیا کے افسردہ دلوں کو جاں بخش، حرارت بخشنے والی تپش اور سوز کی ضرورت ہے، اور یہ قرآن مجید کی بتائی ہوئی حکمت ہے کہ ممکن ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو وہی تمہارے لیے خیر کا باعث بن جائے، اور اگر چند روز پہلے کی خبریں سچ ہیں تو اس کا عملی ظہور بھی شروع ہوا کہ خود امریکہ میں قرآن مجید میں شغف میں اضافہ ہوا اور متعدد نفوس کو اس کی وجہ سے قبول اسلام کی نعمت بھی نصیب ہوئی۔

علامہ شبلی اور دارالمصنفین اور اس کے ترجمان معارف کے پیش نظر ہمیشہ یہی مقصد رہا کہ اسلام کی تعلیمات زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے عام ہوں، سیرت، سیر، تاریخ، ادب، فلسفہ و کلام ہر عنوان سے یہی جذبہ کارفرما رہا، ایک مدت گزر گئی یعنی اب دارالمصنفین اور معارف کی زندگی سو سال پورے کرنے جارہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی بارگاہ میں حسن نیت کا حسن قبول ہے، چند روز پہلے ممبئی کے مشہور اخبار ''انقلاب'' میں مشہور محقق، ادیب، صحافی اور شاعر جناب شمیم طارق نے صد سالہ جشن کی جانب متوجہ کیا ہے، یہ محض شاعرانہ خیال نہیں، دارالمصنفین سے تعلق رکھنے والوں کے ذہن میں پچاس سالہ جشن کی یادیں محفوظ ہیں، برصغیر بلکہ عالم اسلام میں اس صدا کی بازگشت کے ہم بھی منتظر و مشتاق ہیں، وما ذلك على الله بعزيز۔

افسوس کہ ۱۴ر ستمبر کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ مالیات کے امین و معتمد، دنیوی زندگی کی امانت کو ادا کرنے کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جاملے، وہ استاذ الاساتذہ محمد سمیع صدیقی مرحوم کے صاحب زادے تھے جن کا تعلق ندوے سے مکانی ہی نہیں روحانی بھی ہمیشہ رہا، وہ ندوہ اور خصوصاً مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عاشقوں میں تھے اور خود ایک باکمال اہل قلم تھے، ایسے باکمال کا اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کو قبول فرما کر بلند درجات سے نوازے۔

مقالات

سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون کا سنۂ تالیف

پروفیسر ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی

فکر و فلسفۂ ولی اللّٰہی اور اس پر مبنی تصانیف حضرت شاہؒ کے سنین تالیف پر مختلف خیالات ملتے ہیں - یہ خاصا مشہور خیال ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دو بڑے تصنیفی ادوار تھے: ایک سفر حرمین شریفین سے پہلے کا دور یعنی ۱۷۰۳ء-۱۷۳۲ء کا زمانہ اور دوسرا زیارت حرمین کے بعد کا دور: ۱۷۳۲ء-۱۷۶۲ء کا- ہمارے بعض جید علماء اور دوسرے اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت شاہ اپنی تعلیم و تربیت مکمل کرنے کے بعد درس و تدریس میں مشغول رہے اور وہ قریب بارہ برس کا زمانہ ہے- حضرت شاہ ہی کے بیان سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ ہی نہیں دی- مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس خیال کا اظہار غالباً سب سے پہلے کیا تھا: ''......واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سفر حج سے پہلے کا جو حصہ ہے اس میں تصنیف و تالیف کا بظاہر آپ نے کچھ کام نہیں کیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس کا خیال بھی نہ تھا''- ان کے بعض ہم نوا اہل علم نے نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ یہ بھی فیصلہ فرمادیا کہ ''ہمارے پاس اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ شاہ صاحب کی کون سی کتاب کس دور کی ہے''-

تصانیف حضرت شاہ کے بارے میں ایسی آراء تعمیم کی پیداوار تو ہیں ہی نقص معلومات پر بھی مبنی ہیں- (مناظر احسن گیلانی، تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ، کراچی ۱۹۵۹ء، ۲۶۴-۲۶۵؛ محمد فاروق قادری، تقدیم انفاس العارفین، لاہور، ۱۹۹۰ء)

ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-

حضرت شاہ کے اپنے بیانات، ان کے تلامذہ واخلاف کی شہادتوں اور تاریخی ثبوتوں سے واضح ہوتا ہے کہ بہرحال حضرت شاہ نے اپنے سفر حرمین شریفین سے قبل کے دور میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا اگرچہ اس کی رفتار سست اور پیداوار کم تھی۔ اس لحاظ سے تو ان کی تالیفی کارکردگی کو کم کہا جا سکتا ہے مگر اس کی سرے سے نفی نہیں کی جا سکتی۔ زیارت حرمین شریفین کے بعد کا دور حضرت شاہ کی تالیفی کارکردگی کا اصل دور ہے جب ان کی تصانیف کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ متعدد اہل تحقیق نے حضرت شاہ کے ادوار تصنیف قائم کیے ہیں اور بڑی کدوکاوش سے بتایا ہے کہ کون سی تصنیف کس دور کی ہے بلکہ ان میں سے متعدد تصانیف کی حتمی توقیت کی گئی ہے جو حضرت شاہ کی واضح تصریحات پر مبنی ہیں یا دوسرے اہل فن نے بیان کی ہیں۔ متاخرین میں فکرو فلسفہ ولی اللہی کے چند ماہرین نے بڑی جستجو و تحقیق سے ان کے سنین/ادوار تصنیف طے کیے ہیں۔ ان میں غلام حسین جلبانی، اطہر عباس رضوی اور مفتی محمد مظہر بقا خاص اہمیت اور مرتبت کے حامل ہیں کہ تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ دوسرے بزرگوں میں غلام مصطفیٰ قاسمی، جے ایم ایس بالیون (بلجان) اور بعض دوسروں نے بھی تالیفات شاہ کا پتہ لگایا ہے۔ جوں جوں معلومات بڑھتی جاتی ہیں اور تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے حضرت شاہ کی تصانیف کے ادوار یا زمانے کی تعیین کی جا رہی ہے۔ آیندہ تحقیقات ان کی تصانیف کی توقیت کے بارے میں مزید حتمی اور قطعی باتیں بتا سکتی ہیں۔ (محمد رحیم بخش، حیات ولی، لاہور، ۱۹۵۵ء)

غلام حسین جلبانی، لائف آف شاہ ولی اللہ (انگریزی)، دہلی ۱۹۸۰ء، باب سوم: ۳۲-۴۲۔

اطہر عباس رضوی، شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمس (انگریزی)، کینبرا ۱۹۸۰ء، ۲۲۰-۲۲۸۔

محمد مظہر بقا، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی ۱۹۸۶ء، ۱۳۵-۱۶۱: ادوار تصنیف پر مبسوط بحث۔

نثار احمد فاروقی، مقدمہ نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، پھلت ۱۹۹۸ء، ۸۷-۹۳۔

غلام مصطفیٰ قاسمی، مقدمہ التفہیمات الالٰہیہ، حیدرآباد سندھ، ۱۹۹۷ء، ۱/۱۴-۳۸۔

جے ایم ایس بالیون، ریلجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی اللہ دہلوی (انگریزی)، لائیڈن ۱۹۸۶ء، مقدمہ: ۷-۱۴۔

ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، لکھنؤ ۱۹۸۴ء، ۵۔

سعید احمد پالن پوری، رحمۃ اللہ الواسعہ، دیوبند ۲۰۰۱ء، ۱۔

محمد یاسین مظہر صدیقی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی - شخصیت و حکمت کا ایک تعارف، علی گڑھ ۲۰۰۱ء، ۱۳-۲۱۔

حجۃ اللہ البالغہ کا سنۂ تالیف، مشمولہ حجۃ اللہ البالغہ - ایک تجزیاتی مطالعہ، علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۲ء، ۱-۱۰۔

اس طویل اور ضروری تمہید کے بعد اصل بحث یہ کرنی ہے کہ سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون کا سنۂ تالیف کیا ہے؟ ان اہل علم و قلم کے افکار و نظریات سے بحث نہیں جو شاہ صاحب کی کتابوں کے دور کو بھی نہیں جانتے اور اس کو واضح بات کہتے ہیں۔ مذکورہ بالا اہل تحقیق نے بھی حضرت شاہ کے اس تصنیفی کارنامہ کی تاریخ یا دور متعین کرنے میں اپنی دشواری یا ناکامی کا اعتراف کیا ہے، ان میں سے بیشتر نے تو یہ لکھا ہے کہ حضرت شاہ نے امام ابن سید الناس کے رسالہ سیرت نور العیون فی تلخیص سیر الامین المامون کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن کب کیا تھا اس کا پتہ نہیں لگا سکے۔ مفتی محمد مظہر بقا نے اپنے تجزیاتی مبحث ''ترتیب تصانیف کا خلاصہ'' چھ ادوار پر مشتمل کیا ہے اور ہر دور کی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر ان میں سے کسی میں بھی سرور المحزون شامل نہیں ہے اور آخر میں یہ وضاحت کردی ہے کہ باقی کتابوں کے بارے میں یقین تو کیا شبہ کے طور پر بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس دور کی تصانیف ہیں واللہ اعلم۔ (محمد مظہر بقا، ۱۶۰-۱۶۱، نیز موضوعاتی فہرست تصانیف شاہ، ۱۳۹ و حاشیہ ۱)

دوسرے اہم توقیت نگار اطہر عباس رضوی نے اپنے ادوار کے اواخر میں ان تصانیف شاہ کی فہرست دی ہے جن کی تاریخ آسانی سے متعین نہیں کی جاسکتی۔ اس فہرست میں تیسری کتاب سرور المحزون ہے:

(اطہر عباس رضوی، ۲۲۳ - ۲۲۴ : Other important works of Shah Wali-Allah, the dates of which cannot be easily ascertained are : ....

(3.Surur al-mahzun....

مورخ موصوف نے اپنی توقیت کے ضمن میں اپنے مآخذ کا ذکر کیا ہے اور ان میں غلام حسین

جلبانی بھی شامل ہیں ۔ موخر الذکر نے بھی سرور المحزون کی تالیف کا زمانہ نہیں بتایا ۔ بلکہ انہوں نے بعض دوسرے اہل علم وفکر کی مانند حضرت شاہ کی اس تالیف کا ذکر ہی نہیں کیا کم از کم توقیت تصانیف کے ضمن میں ۔ لہذا دوسرے اہل علم اور ماہرین فکر ولی اللٰہی کے ہاں اس کی تلاش ہی فضول ہے ۔ یہ ساری دقتیں اس لیے پیش آتی ہیں کہ بسا اوقات حضرت شاہ نے اپنی تصانیف کی تاریخ نہیں بیان کی اور نہ ہی ان کے شاگردوں اور مرتبین کتب و رسائل نے یہ تکلیف گوارا کی ۔ ان کی تصانیف کے مخطوطات کے ترقیموں میں بھی ان کا بالعموم حوالہ نہیں ملتا ۔ اور بسا اوقات مخطوطات کی کتابت کا سنہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ کاتبین کرام اس کے بعض اوقات کی خاص ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔

خوش قسمتی سے سرور المحزون کے ایک مخطوطہ سے اس کی تالیف کی حتمی تاریخ معلوم ہوتی ہے ۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مخطوطات کے شعبہ میں متعدد صاحبان خیر کے خطی عطایا کے ذخیرے محفوظ ہیں ۔ ان میں سے متعدد سرور المحزون اور نور العیون کے مخطوطات بھی ہیں ۔ اول الذکر کا ایک بڑا قیمتی اور نادر مخطوطہ سبحان اللہ کلکشن میں ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں: ۹۲۰/۵۰ ف ضمیمہ، اوراق ۳۲ ۔ اسی میں ایک ترقیمہ بھی ہے جو مسئلہ کا حل بتاتا ہے ۔ اس کے کاتب ایک طالب علم واحد علی نامی تھے اور انہوں نے سرور المحزون کا یہ مخطوطہ اپنے دیار کے ایک عالم کی فرمائش پر لکھا تھا جو بقول ان کے: ''مولانا، مرشدنا، افضل العلماء، اکمل الفضلاء بلادنا المشتہر حضرت مولوی شمس الدین صاحب بسط اللہ طلب فیض کرامتہ علینا'' تھے ۔ حیرت کی بات ہے کہ کاتب گرامی قدر نے اپنے مخطوطہ کی تاریخ کتابت نہیں دی ۔ بہر حال ترقیمہ کی عبارت ہے ۔ ''ترقیمہ: باتمام رسید نسخۂ سرور المحزون ترجمہ نور العیون از تصانیف شاہ ولی اللہ صاحب در سیر نبی و احوال الرسول، غفر اللہ لہ ولوالدیہ ۱۱۴۸ھ از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم: الحمد للہ علی ذلك وافضل الصلوات واکمل التحیات علی اخص خلقه محمد صلی اللہ علیہ وسلم وآله اجمعین ''۔ ورق ۳۲ ۔

اس ترقیمہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ نے سرور المحزون کی تالیف ۱۱۴۸/۱۷۳۵ میں کر لی تھی ۔ یعنی اپنی وفات ۱۱۷۶/۱۷۶۲ سے قریب قریب ایک ربع صدی پہلے ۔ عیسوی تقویم

کے حساب سے ۱۱۴۸ ہجری کا سال ۲۴ مئی ۱۷۳۵ء اور ۱۲ مئی ۱۷۳۶ء کے درمیان پڑتا ہے۔ غالب گمان ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۳۵ء ہی کی تالیف لطیف ہے۔ اس طرح وہ حضرت شاہ کی ابتدائی عمر تالیف کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے جب حضرت شاہ کی عمر محض ۲۴ سال تھی۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ زمانہ حضرت شاہ کے حرمین شریفین سے واپسی کے معاً بعد کا زمانہ ہے جب حضرت شاہ کا قلم مبارک بہت تیز رفتاری سے تصنیف و تالیف میں لگ چکا تھا۔ اور اسی زمانے میں ان کی ام الکتاب حجۃ اللہ البالغہ وجود میں آئی تھی اور متعدد دوسری کتابیں اور رسالے بھی اسی کے ساتھ ساتھ ارتقا پاتے رہے تھے اور ساتھ ساتھ یا معاً بعد وجود میں آتے رہے تھے۔ مفتی محمد مظہر بقا وغیرہ کے مطابق ۱۱۴۶-۱۱۴۸ھ کے درمیانی عرصے میں حضرت شاہ کی آٹھ کتابیں: ۱- القول الجمیل، ۲- فیوض الحرمین، ۳- تعریب رسالہ رد روافض، ۴- حجۃ اللہ البالغہ، ۵- لمعات، ۶- الطاف القدس، ۷- انفاس العارفین، اور ۸- ہمعات لکھے جا چکے تھے۔ (محمد مظہر بقا، ۱۶۰)

خاکسار راقم نے اپنے کتابچہ اور مضمون مذکورہ بالا میں تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کی تالیف حرمین شریفین سے واپسی کے بعد ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں کسی وقت شروع ہوگئی تھی اور تین سال کی محنت شاقہ کے بعد وہ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء سے قبل تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود حضرت شاہ کا بیان ہے جو بالواسطہ ہے۔ اپنی کتاب تصوف ہمعات کے بارے میں حضرت شاہ نے وضاحت کی ہے کہ اس کی تالیف سے جمادی الثانیہ ۱۱۴۸ھ/اکتوبر-نومبر ۱۷۳۵ء میں فراغت ہوئی۔ اسی میں اپنی کتاب حجۃ کی نہ صرف تکمیل کی خوش خبری دی ہے بلکہ اس کے مقبول خواص و عوام ہونے کی بات کہی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جمادی الثانیہ ۱۱۴۸ھ سے قبل بلکہ کافی پہلے کتاب حجۃ تالیف ہوکر منظر عام پر آچکی تھی اور عوام و خواص میں متداول و مقبول ہو چکی تھی۔ بعض دوسرے قرائن بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔

سرور المحزون کے مذکورہ بالا مخطوطہ کے ترقیمہ اور اس کے کاتب واحد علی کی وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شاہ کا یہ رسالہ سیرت بھی اسی سال کسی وقت تیار ہوگیا تھا۔ اور اس کی تالیف میں حضرت شاہ کو کوئی خاص زحمت یا دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ فارسی ان کی مادری زبان رہی ہو یا نہ رہی ہو ان کو اس پر پورا عبور تھا۔ جس طرح ان کو عربی زبان میں تبحر خاص

حاصل تھا۔حرمین شریفین کے قیام دوسالہ کے دوران ان کے شیوخ واساتذہ اور دوسرے اہل علم اورعوام سے ربط وتعلق نے ان کی عربی پراور سان چڑھادی تھی اوروہ خالص فصیح وبلیغ عربی لکھتے تھے۔ان دونوں زبانوں کے مزاج،تہذیب اور حقیقت سے واقف تھےاورایک سے دوسری زبان میں ابلاغ عظیم پرقدرت رکھتے تھے۔وہ قیام حرمین کے دوران اپنے شیخ کل حضرت ابوطاہر کردی مدنی (محمد بن ابراہیم کورانی؛ -ر۱۷۳۳ء) کی فرمائش پرحضرت مجددالف ثانی (شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی،۱۴رشوال ۹۷۱/ ۲۶رجون ۱۵۶۴ - ۲۸رصفر ۱۰۳۴/۱۰ردسمبر ۱۶۲۴) کے فارسی رسالہ "رد روافض" کا عربی ترجمہ" المقدمة السنية فی الانتصار لفرق السنية "کے عنوان سے کرچکے تھے۔اورزہراوین کا عربی متن فارسی ترجمہ وتفسیر میں اس سے پہلے ہی ڈھال چکے تھے۔ اورفتح الرحمان کے بہت سے حصے بھی اسی زمانے میں لکھ چکے تھے۔فارسی ترجمہ وتفسیرقرآن نے ان کوعربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی عظیم صلاحیت بخش دی تھی جس کا ثبوت قدم قدم پرسرور المحزون میں ملتا ہے۔علم کامل،زبانوں پرقدرت،فنی تبحراورترجمہ کے تجربے نے ان سے چند دنوں میں یہ کام کرالیا تھا۔

حضرت شاہ کی ایک "تالیفی سنت" کا ذکرکرنا بھی اس مقام پرضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ سرورالمحزون کی تالیف کے بارے میں ایک خاص بات بتاتی ہے،گووہ براہ راست سنۂ تالیف کی تعیین نہیں کرتی،حضرت شاہ کی عادت تھی کہ وہ اپنی تالیفات کے مسودات کواپنے خاص تلامذہ واحباب کواشاعت سے قبل ضرور دکھاتے تھےاوران کی رائے معلوم کرتے تھے۔ان کے مشوروں اورضروری تصحیحات کوبھی قابل غوراورقابل قدرسمجھتے تھے۔بالخصوص مولانا شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کے تووہ خود عاشق تھےاوران کے مشورہ اورنظرثانی کے بغیراپنے مسودات ورسائل کومنظر عام پرنہ پیش کرتے تھے۔شاہ محمد عاشق پھلتی کے نام اپنے مکتوب: ۳۶ میں ان کی سنت تالیفی اور سرورالمحزون کے ترجمہ کے بارے میں بہت قیمتی باتیں لکھی ہیں۔لکھتے ہیں:

"......آپ کا خط بہجت نمط پہنچا اورحقیقت معلوم ہوئی،چونکہ اس فقیر کے دل میں یہ بات ہے کہ فقیر کی تصنیفات وتالیفات کی جمع وتدوین میں آں برادرعزیزالقدرکوایک خاص دخل ہے،تبییض کے لحاظ سے بھی اوراس کے

علاوہ بھی۔

اسی بنا پر نورالعیون کے ترجمہ کا نام آپ پر موقوف رکھا گیا ہے تاکہ اس نام رکھنے کے سبب سے ہی اس کتاب کی تکمیل آپ کے ہاتھ سے ہو۔

آپ جو چاہیں اس ترجمہ کا نام رکھیں۔ترجمۂ نورالعیون کو حامل رقعہ کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔والسلام''۔ (نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مرتبہ مفتی نسیم احمد فریدی، پھلت ۱۹۹۸ء، ۲۱۳/۱)

حضرت شاہ کے گرامی نامے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: اول یہ کہ حضرت شاہ نے ترجمہ کی تکمیل کافی پہلے کرلی تھی اور پھر اسے شیخ عاشق پھلتی کے پاس بھیجا۔دوسری یہ کہ شیخ پھلتی نے اس کا نام ''سرورالمحزون فی ترجمۃ العیون'' رکھا۔جیسا کہ مذکورہ بالا مکتوب سے معلوم ہوتا ہے۔ممکن ہے کہ حضرت شاہ نے اس میں کچھ ترمیم بھی کی ہو۔مگر وہ اصلاً شیخ پھلتی کا رکھا ہوا نام ہے۔انہوں نے بہرحال ترجمہ فارسی کے مسودے کو نہ صرف پڑھا ہوگا بلکہ اسے اس کے عربی متن سے غالباً ملایا بھی ہوگا کہ اہل علم کے ایسے ہی طریقے ہوتے ہیں۔

سرورالمحزون کے ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں تالیف ہونے کے چند قرائن بھی ہیں اور وہ خاصے پختہ و مستحکم ہیں۔سب سے اول و مستحکم تر قرینہ یہ ہے کہ اسی برس حضرت شاہ کی کتاب حجۃ کی اشاعت ہوچکی تھی۔اس کے اواخر میں حضرت شاہ نے کسی خاص ترتیبی یا تالیفی منصوبے کے تحت نہیں بلکہ اپنے دل کی لگن یا کسی وجدانی اشارہ کے تحت ایک باب سیر النبی ﷺ پر شامل فرما دیا تھا۔وہ پوری کتاب کے ماقبل اور مابعد ابواب کے سیاق وسباق میں صحیح نہیں بیٹھتا۔بہرحال حضرت شاہ نے سیرت نبوی کا یہ باب کتاب حجۃ کے خالص حکیمانہ وفلسفیانہ انداز وعبارت میں لکھا ہے۔جو اپنے اسلوب، زبان و بیان اور دوسرے عناصر کے سبب عام لوگوں کی فہم سے بہت بلند ہے۔لہذا قیاس یہ کہتا ہے کہ حضرت شاہ نے ایک مختصر رسالۂ سیرت لکھنے کی تجویز اپنے دماغ میں کی ہو۔اور اس کے لیے ایک مختصر رسالہ لکھنا چاہتے ہوں۔

اس کا امکان ہے کہ اس باب سیرت کو دیکھنے کے بعد حضرت شاہ کے بعض دوستوں اور احباب نے فرمائش کی ہو کہ وہ امام ابن سیدالناس کے مختصر سیرت نورالعیون کا فارسی میں ترجمہ کر کے

عام وخاص کے استفادے کے لیے پیش کردیں۔ حضرت شاہ نے خود اپنے مختصر مقدمہ سرورالمحزون میں ان احباب کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے: ''بعض اعزۂ احباب واجلہ اولی الالباب...... ازیں فقیر ترجمۂ کتاب نور العیون فی تلخیص سیر الامین المامون...... درخواستند از اجابت مسئول ایشاں چارہ ندید......'' (ص:۲)۔ حضرت شاہ نے ان محترم ومکرم احباب وعلماء ومشائخ کی فرمائش پر اس کا ترجمہ فرمایا جیسا کہ اس سے قبل اپنے استاذ گرامی شیخ ابوطاہر کردی کی فرمائش پر رسالہ حضرت مجدد کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔

مشہور ہے کہ یہ فارسی ترجمہ شیخ وقت حضرت مرزا جان جاناں مظہر (۱۱۱۱ر-۱۱۹۵) کی فرمائش پر کیا گیا تھا جیسا کہ سرورالمحزون کے حاشیہ میں ایک نوٹ ہے: ''سوای مرزا جان جاناں شہید متخلص بمظہر قدس سرہ'' اور متعدد متاخرین علمائے کرام اور ماہرین فکر ولی اللّٰہی نے اپنی اپنی نگارشات میں حضرت مرزا کی فرمائش ہی کو اصل سبب تالیف قرار دیا ہے مگر ابھی تک کم از کم خاکسار راقم کو ایسی کوئی پختہ شہادت نہیں مل سکی۔ اس سے قطعی انکار نہیں ہے کہ حضرت مرزا مظہر بھی ان میں شامل رہے تھے مگر حضرت شاہ کی عبارت بتاتی ہے کہ اہل فرمائش کی ایک جماعت سخنوران اس کی وجہ وبنیاد بنی تھی۔ ان میں شیخ محمد عاشق پھلتی کی شمولیت یقینی معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف حضرت شاہ کی کتابوں کی تبییض وتدوین کے ذمہ دار رہے تھے بلکہ بسا اوقات ان کی تسوید بھی ان ہی کی فرمائش واصرار پر ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی مثال حجۃ اللہ البالغہ کی تسوید و تالیف ہے۔ اور مصفّٰی فی شرح مؤطا تو خالص ان ہی کی کوشش سے مرتب ہو کر شائع ہوئی۔

بہرحال ان قرائن، اسباب اور احوال نے حضرت شاہ کو بھی اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنا طبع زاد رسالۂ سیرت لکھنے کی بجائے امام ابن سید الناس کے مقبول ومتداول اور عظیم الشان مختصر سیرت کو فارسی میں ڈھال دیں اور انہوں نے چند روز میں ایسا ہی کیا لہٰذا سرورالمحزون ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء میں وجود میں آگیا اور غالباً کتاب حجۃ کے باب سیرت کے بعد ہی اس کے لکھنے کا ڈول ڈالا گیا اور اس کی تکمیل کی گئی۔ اس طرح کتاب حجۃ کے باب نے ایک اور تالیف شاہ کو جنم دیا۔ جس طرح اس نے بعض دوسری کتب ورسائل کو جنم دیا تھا۔ ان میں سے ہمعات تو بالخصوص اسی کی زائیدہ وپروردہ ہے۔ یہ بحث دوسری ہے اور خاصی تحقیق طلب بھی لہٰذا اس پر گفتگو پھر کبھی کی

جائے گی۔

ایک امکان یہ ہے کہ مذکورہ بالا مخطوطہ سرورالمحزون کے ترقیمہ کی عبارت میں جو تاریخ ہے وہ کتابت کی تاریخ ہو اور تالیف شاہ کی تاریخ نہ ہو۔ جیسا کہ بعض ظاہری نگاہوں میں اس کا مقام و مرتبہ ہو سکتا ہے اور ہے بھی۔ اس سے ہمارا قیاس اور اس پر مبنی نتیجہ بلکہ صراحت اور وضاحت اور زیادہ پختہ اور یقینی ہو جاتی ہے۔ اگر اسے سنۂ کتابت مان لیں تو یہ لازم آتا ہے کہ رسالہ سرور المحزون بہر حال اس سنہ میں یا اس سے قبل ضرور بالضرور مرتب و مشتہر ہو چکا تھا اور نہ صرف مرتب و مولف ہو چکا تھا بلکہ مشہور اور مقبول بھی۔ کیونکہ اسی صورت میں حضرت مولوی شمس الدین صاحب نے اس کی فرمائش کر کے کتابت کروائی تھی۔ حضرت مولوی کے بارے میں ہماری تحقیق ابھی باقی ہے کہ وہ کون تھے اور کس زمانے کے، ورنہ یہ گتھی بھی سلجھ جاتی۔

ایک قیاس ہے کہ ان سے مراد حضرت مرزا مظہر جان جاناں ہی ہیں۔ ان کا نام نامی یا مشہور نام شمس الدین العلوی بتایا جاتا ہے جیسا کہ حدائق الحنفیہ وغیرہ کے ماہرین سوانح نے لکھا ہے۔ اگر چہ ان کو مرزا جان جاناں سے بھی مشہور قرار دیا گیا ہے اگر ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء کو سنۂ کتابت مان لیں تو حضرت مرزا سے زیادہ اور کوئی وجہ کتابت نہیں معلوم ہوتی کہ اس دور میں وہی شمس الدین کے نام سے مشہور تھے۔ اس کے علاوہ ان کے لیے جو القاب و آداب کاتب نے استعمال کیے ہیں وہ بھی انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو مذکورہ بالا مخطوطہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے لیے تیار کرایا تھا۔

بہر حال ابھی اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور وہ خاصی دشوار ثابت ہوگی کیونکہ محض اس عبارت کی بنا پر شخصیت کی تعیین بہت مشکل ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اور مزید قرائن اور شہادتیں مخطوطہ سے یا دوسرے مآخذ سے مل جائیں جو اس دقت کو حل کر دیں۔ (فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، مرتبہ خورشید احمد خاں، لاہور، مکتبہ حسن سہیل غیر مورخہ، ۴۷۱: ''شیخ شمس الدین العلوی المعروف بہ مرزا مظہر جان جاناں، م ۱۱۹۵)

عبدالرزاق قریشی، میرزا ''مظہر جان جاناں اور ان کا کلام''، اعظم گڈھ ۱۹۷۹ء، ۲۲: ''جان جاناں نام، مظہر تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب، علوی نسب، حنفی مذہب''۔ بحوالہ مولوی

نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص:٦)

بہر حال مذکورہ بالا مخطوطہ کے ترقیمہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ حضرت مرزا جان جاناں کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ وہ براہ راست حضرت شاہ کے مسودہ سے نقل کیا گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا قرینہ یہ ہے کہ کاتب واحد علی نے اس میں اس تصنیف کی تاریخ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء دی ہے اس سے قبل صرف حضرت شاہ یعنی مولف گرامی قدر کا ہی مسودہ موجود تھا، کسی دوسرے کی موجودگی خاصی بعید بات ہے۔ بہر حال اس کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ شیخ محمد عاشق پھلتی وغیرہ میں سے کسی کا مخطوطہ رہا ہو۔ لیکن حضرت شاہ کے حضرت مرزا سے جو قدیم، مخلصانہ تعلقات تھے اور حضرت شاہ جس قدر ان کا احترام و تکریم کرتے تھے اس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت مرزا نے ہی مسودۂ شاہ سے نقل حاصل کی ہوگی۔

آنحضورﷺ کی سیرت طیبہ پر یورپین تصانیف

ڈاکٹر محمد حمادہ

تلخیص: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

آنحضورﷺ کی ذات اقدس کے متعلق مغرب میں شروع دن سے لکھنے لکھانے اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے لیکن زیادہ تر دشمنی اور تعصب کے ماحول میں۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ دنیا کو تحمل، برداشت اور رواداری کا درس دینے والا مغرب بذات خود اسلام اور پیغمبر اسلامﷺ کے متعلق بے حد تعصب، جہالت اور عدم برداشت کا مظہر رہا ہے اور صدیوں سے چلی آنے والی دشمنی اور تعصب کی روایت کو موجودہ دور میں بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

مغرب میں آنحضورﷺ کی ذات کے متعلق جو جھوٹا اور غلط پروپیگنڈا کیا جاتا رہا اور جس کی رو میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی بہہ گئے، اس کا مطالعہ دراصل مغربی ذہن کا مطالعہ کرنے کے لیے بے حد ضروری اور اہم ہے۔ ہم مغرب میں مطالعہ سیرت کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔ ابتدائی دور۔ ۲۔ صلیبی جنگوں کا دور۔ ۳۔ نشاۃ ثانیہ سے لے کر انیسویں صدی تک کا دور۔ ۴۔ انیسویں صدی اور مابعد کا دور۔

ابتدائی دور: عیسائیوں کی قدیم ترین کتاب جس میں رسول اکرمﷺ کا ذکر ہے، وہ سیبوس الارمنی کی ہے جو پہلی صدی ہجری رساتویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، اس میں صرف یہ ذکر ہے کہ محمد، اسماعیلی تھے، انہوں نے نبوت کا دعوی کیا اور اپنے وطن کے لوگوں کو دین ابراہیمی کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔ یہ کتاب لینن گراڈ سے ۱۸۷۹ء میں چھپی (۱۰۶ صفحات) اس کا روسی زبان

ریاض، سعودی عرب۔

میں ترجمہ مستشرق باخیان کی نگرانی میں ہوا اور ۱۸۶۲ میں چھپا (صفحات ۱۱۶-۱۱۸) (۱) ظاہر ہے یہ ذکر ضمنی نوعیت کا تھا۔

سب سے پہلا عیسائی جس نے آنحضور ﷺ پر تصنیف وتالیف کا آغاز کیا یوحنا الدمشقی John of Dinascus (۷۰۰تا۷۴۹ء) تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے پورے تعصب اور دجل وفریب کے ساتھ اسلام کے خلاف لکھا۔

اس کی ولادت دمشق میں ہوئی، خلیفہ اموی کی خدمت میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ عیسوی تعلیمات کے لیے دیرا (کنیسہ) میں چلا گیا۔ اس نے اسلام کا ذکر ایک ''بت پرست جاہلی مذہب'' کے طور پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ کعبہ کا ''افرودیت'' نامی بت کے ساتھ تعلق تھا، اس نے ایک مسلمان اور ایک عیسائی کے درمیان خیالی مکالمہ بھی نقل کیا ہے جس میں اس نے مسیحیت کا بھرپور طریقے سے دفاع کیا ہے۔ یوحنا نے ان دونوں کی گفتگو دوسرے عیسائیوں کی رہنمائی کے لیے نقل کی ہے، اس نے رسول اکرم ﷺ کا ذکر کسی نئے دین کے بانی کے طور پر کرنے کے بجائے (العیاذ باللہ) ایک بدعتی کے طور پر کیا ہے اور یہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ محمد ﷺ مسیحی تھے اور آپ نے عیسائیت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی (۲)، یہ غلط فہمی سترہویں/اٹھارہویں صدی عیسوی تک برقرار رہی۔ اس نے اسلام کا تعارف ایک بت پرست مذہب کے طور پر کرایا ہے اور یہ کہ ان عقائد کی تعلیم آنحضور ﷺ کو ایک اربانی نامی راہب نے دی تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کریم میں محمد ﷺ کا ذکر جمل اللہ (اللہ کے اونٹ) کے طور پر آیا ہے۔ اسی سے اس کے مبلغ علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۲- اسی طرح کا ایک رسالہ ہے جو عبدالمسیح بن اسحاق الکندی سے منسوب ہے لیکن خود مغرب میں یہ مشکوک ومشتبہ ہے۔

اس رسالے کو مغرب میں انیسویں صدی میں عربی متن کے ساتھ Tiea نے لنڈن سے ۱۸۸۰ء میں شائع کیا اور اس کے ساتھ اس کا انگریزی میں خلاصہ بھی دیا، اسی طرح معروف متعصب مسیحی مولف ولیم میور نے بھی ''رسالہ الکندی'' کے نام سے اپنی کتاب میں اسے ضمیمہ کے طور پر لنڈن سے طبع کیا، یہ رسالہ عہد وسطی میں بھی بے حد معروف رہا، اس کا لاطینی ترجمہ پطرس نامی شخص

نے کیا جو طلیطلہ (اندلس) کا رہنے والا تھا، اس کا خلاصہ فیسانت دوبوفیہ کی کتاب Speculum (دیکھیے آیندہ صفحات) میں شامل ہیں۔

عیسائیوں میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی نسبت الکندی کی طرف درست ہے، ان کے مطابق الکندی جو المامون الرشید العباسی (۱۹۹-۲۱۸ھ/۸۱۳-۸۳۳ء) کے زمانے کا معروف نسطوری عالم تھا، نے یہ رسالہ لکھ کر خلیفہ کے چچازاد بھائی عبداللہ عباسی کو بھیجا، جس نے اسے قبول اسلام کی دعوت دی تھی۔

اس رسالے میں مسیحیت کے حق میں کئی دلائل و براہین پیش کیے گئے ہیں جن میں خصوصی طور پر قدیم مسیحی کتب کی مدد سے عقیدۂ تثلیث کا دفاع کیا گیا ہے، بعدازاں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ایسے دلائل جن سے نبوت کا اظہار اور اثبات ہوتا ہے، یہاں مفقود ہیں جو مولف کے خیال میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت میں وافر مقدار میں نظر آتے ہیں، اس کے خیال میں قرآن مجید کی آیات میں تناقض ہے اور جب غور سے ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں ایسی آیات نظر آتی ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں، آخر میں اس نے حضرت مسیح کی زندگی اور ان کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے اور پھر اس نے عبداللہ کو عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔(۳)

جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ مصنف کا یہ نام محض وہم ہے، المامون کے زمانے میں بغداد میں اس نام کا کوئی شخص موجود نہ تھا۔ مورخین نے المامون کے دور کے تمام اہل علم وفضل کے نام درج کیے ہیں ان میں عرب بھی ہیں اور غیر عرب بھی، مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، لیکن اس رسالے یا اس شخص کے نام کی طرف کوئی ادنی اشارہ بھی موجود نہیں۔ کئی عیسائی علماء بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔

۴- اسی دور کا ایک اور مولف نیکتیاس البیزنطی (Nicatas of Byzantion) ہے، جس نے ''دحض الاسلام'' نامی کتاب باسل اول (۸۶۷-۸۸۶ء) کے زمانے میں اس کی فرمائش پر تحریر کی، اس بوزنطی حکمراں نے یہ خواہش کی تھی کہ مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور مصنف عیسائیت کے فضائل ومحاسن اور اسلام کے نقائص پر کتاب مرتب کرے، چنانچہ اس کتاب کے حصہ اول میں بوزنطی کنیسہ کے عقائد کے مطابق مسیحی عقائد، مثلاً اللہ تعالیٰ

کی صفات اور حضرت مسیح کی الوہیت وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مولف نے رسول اکرم ﷺ اور قرآن کے خلاف زہر اگلتے ہوئے العیاذ باللہ بار بار نبی اکرم ﷺ کے لیے کاذب کا لفظ استعمال کیا ہے، اسی طرح اس کا خیال تھا کہ قرآن کریم جھوٹ اور غلط بیانیوں کا بے اصل مجموعہ ہے، نیز یہ کہ قرآن الوہیت مسیح اور ان کو صلیب پر لٹکائے جانے کی مخالفت کرتا ہے اور قرآن کا تصور توحید (لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ) بھی اس کے خیال میں درست نہیں ہے۔

اس طرح قرون وسطی میں آنحضور ﷺ کی شخصیت کے بارے میں مغرب پوری طرح جہالت اور بدترین تعصب کا شکار تھا۔ان کا گمان تھا کہ العیاذ باللہ آپ ﷺ ایک بدعتی فرقے کے بانی ہیں۔

۵-مسلمانوں کے لیے "بدعتی ہونے" کے نظریے کی اشاعت تھیوفانس (Theo Phanes موجود مابین ۷۵۷- ۸۱۸ء) نے بھی کی۔اس نظریے کی مغرب میں وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی۔حتی کہ انستاسیوس نامی پادری نے کلیسا کی تاریخ میں بھی اسے درج کیا، اس کتاب میں ان تمام اہم واقعات کا ذکر ہے جو آپ کی حیات طیبہ میں پیش آئے ، مصنف نے سچ اور جھوٹ دونوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ملایا کہ تمام حقائق مسخ ہوگئے۔مثلاً یہ کہ آپ نے ابتدائی زندگی میں یہودیت اور مسیحیت کا مطالعہ کیا تھا اور تمام کتب مقدسہ پڑھی تھیں اور یہ کہ ایک ایسے راہب نے جسے کلیسا نے نکال دیا تھا، محمد ﷺ کے دعوائے نبوت میں مدد کی تھی اور یہ کہ العیاذ باللہ آپ کو دورے پڑتے تھے۔

اس دور میں مسلمانوں کے متعلق جزیرہ نمائے آئبیریا یعنی اندلس کے مسیحیوں نے کتابیں لکھیں ، وہ اسلام سے پہلی صدی ہجری کے آخری سالوں میں روشناس ہوئے تھے لیکن ان کی تحریروں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق "جہل مطلق" نظر آتا ہے، آئبیریا میں برضا و رغبت اسلام کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہورہی تھی ، اس لیے یہاں کے مسیحیوں نے اسلام کی اشاعت روکنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے:

اول: یہ کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق جھوٹی اور غلط سلط خبروں اور روایتوں کو پھیلایا۔

دوم: یہ کہ انہوں نے اسلام کے خلاف وہ تحریک شروع کی جسے مغرب والوں نے

''شہادت کی تحریک'' کا نام دیا ہے۔

اس تحریک کا آغاز عبدالرحمان الاوسط (۲۰۶-۲۳۸ھ) کے زمانے سے عجب انداز سے ہوا، کچھ لوگ مسلمان قاضی کے پاس جاتے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شان اقدس میں دیدہ و دانستہ گستاخی اور بدزبانی کا مظاہرہ کرتے، قاضی انہیں اسلامی احکام کی روشنی میں قتل کی سزا دیتا، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ تحریک مکمل طور پر ختم ہوگئی تاہم مغرب ان لوگوں کو شہید قرار دیتا ہے، اس تحریک کا بانی ایک پادری ''الفارو'' نامی تھا۔ (۴)

اس ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہت سے ہسپانوی عیسائی شوقیہ طور پر عربی زبان و ادب سیکھتے اور عربی میں شاعری کرتے تھے، جب کہ عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو پڑھنے والا کوئی نہ تھا، اس کا اعتراف فارو نے کیا ہے (۵)۔ اسی لیے اس نے اسلام سے بدلہ لینے کی مذموم کوشش کی۔

۷- یہاں کے مصنفوں میں ایک پادری یولیوغیوس القرطبی (Eulogius of Cordova) بھی تھا جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مسلمانوں کے زیر سایہ گزارا اور اگر وہ چاہتا تو تمام حقائق معلوم کرسکتا تھا لیکن اس نے دانستہ ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے تمام معلومات ایک لاطینی نسخے سے حاصل کیے، جو اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ (۶)

اس نے اندلس کی ''خودکشی یا حصول شہادت کی تحریک'' کے دفاع میں رسول اکرم ﷺ کا ذکر انتہائی غلیظ زبان میں کیا ہے، اس نے یہ بھی لکھا کہ پیغمبر اسلام کو امید تھی کہ ان کے جسم کو ان کی وفات کے تین دن کے بعد فرشتوں کی مدد سے آسمان پر اٹھالیا جائے گا (العیاذ باللہ)۔ (۷)

۸- اسی دور کی ایک اور کتاب جس کی مغرب میں وسیع پیمانے پر اشاعت کی گئی، ہسپانوی پادری پدروسان باسکوال (Padro San Pascual) کی کتاب ''الشیعۃ المحمدیۃ'' (Sobro el seton Mahometana) ہے (۸)۔ اس نے بھی سیرت طیبہ کو حتی الوسع بگاڑ کر اور اپنی طرف سے جعلی اور من گھڑت قصے کر کے پیش کرنے کی کوشش کی، جیسے اس نے مکی دور میں اسلام قبول کرنے والوں میں بنوقریظہ کے یہودیوں کو بھی شامل کیا ہے۔

اندلس کے مذکورہ بالا دونوں پادریوں کی کتابیں ایک عرصے تک مغربی مولفین کے لیے اہم مصادر و مآخذ بنی رہیں۔

۹- پادری فینسانت دوبوفیہ (م ۱۲۶۴ء) نے اسلام کے خلاف اپنے بغض کا اظہار کتاب مرآۃ التاریخ (Speculum Historiale) (کتب ۲۳ـ فصول ۲۴-۶۸) میں کیا۔(۹)

یعنی یورپ میں اس وقت لکھی جانے والی تمام کتابوں کا لب و لہجہ مکمل طور پر مخاصمانہ اور مناظرانہ تھا اور ان میں کسی ایک مولف نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا انصاف سے مطالعہ کر کے حقائق پیش کرتا۔

خلاصۂ بحث: سطور بالا میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں جن مغربی تصانیف کا ذکر آیا ہے ان میں درج ذیل باتیں قدر مشترک کے طور پر شامل رہی ہیں:

۱- اسلام کے خلاف لکھنے والے ابتدائی دور کے عیسائیوں اور مغربی مولفین کو اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات سے خدا واسطے کا بیر تھا یہ لوگ جان بوجھ کر حقائق کو مسخ کر کے پیش کرتے۔

۲- اس دور میں جن لوگوں نے آنحضور ﷺ کے خلاف قلم اٹھایا، ان میں زیادہ تر کا تعلق عیسائیوں کے مذہبی طبقے سے تھا، یہ سب کسی نہ کسی کنیسہ کے پادری تھے، جن کے دل اسلام کی مخالفت اور عداوت کی بنا پر پوری طرح سیاہ ہو چکے تھے۔

۳- اس دور میں لکھی گئی کتابیں زیادہ تر جہل مرکب کا مجموعہ تھیں، آنحضور ﷺ کے بارے میں لکھنے والے سرے سے اسلام اور پیغمبر اسلام سے یا تو واقف نہ تھے یا پھر انہوں نے دانستہ اسلام کی تصویر غلط اور بھونڈے انداز میں پیش کی۔

۲-صلیبی جنگوں کا دور: گیارہویں صدی عیسوی میں اسلام اور مسیحیت کے مابین اس تصادم کا آغاز ہوا جسے ''صلیبی جنگوں'' (Crusades) کا دور کہا جاتا ہے اور جو ۱۰۹۶ء سے ۱۳۹۱ء تک جاری رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس دور میں مسیحی علماء اپنے مخالفین کے متعلق صحیح حقائق جانتے اور انہیں پیش کرتے مگر انہوں نے اپنے زمانے کے حالات اور واقعات سے کوئی اثر نہیں لیا اور بدستور اپنی سابقہ روش پر کاربند رہے۔ اس دور کے تمام مولفین کا تذکرہ ممکن نہیں، چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱-پطرس الوقور (Peter The Venerable) نے جو کلونی کے ایک کلیسا کا پادری تھا، ۱۱۴۱ء میں دو لوگوں روبرٹ اور اہرمن کو عربی کتابوں کے لاطینی ترجمہ کے لیے ملازم رکھا، انہوں نے

چار کتابوں کا ترجمہ کیا۔ یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ جن کتابوں کا انہوں نے ترجمہ کیا ان کا اصل نام کیا تھا لیکن پادری مذکور نے ان تراجم پر مشتمل اپنی کتاب کا نام ''حیات المسلمین المکروھین الضالین'' (Chronica menio so et ridiculasa cenarum) رکھا۔ کتاب کے نام سے ہی واضح ہے کہ اس نے اس کتاب میں کیسے کیسے گل کھلائے ہوں گے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کے خاندان، آپ ﷺ کی حیات مبارکہ اور خلفائے راشدین سے یزید اول اور حضرت حسینؓ کی شہادت تک کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی روبرٹ نے قرآن کریم کا لاطینی میں بھی ترجمہ کیا، جو بہت معروف ہوا، حالانکہ یہ ترجمہ صحیح نہیں تھا، یہ ترجمہ پادری پطرس کو پیش کیا گیا تو اس نے بھی اس میں حذف و ترمیم کی، تاہم وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کرسکا کہ مسلمان بت پرست تھے یا ''ایک بدعتی فرقہ'' تھے لیکن یہ ضرور کہا کہ دونوں میں سے کوئی صورت بھی ہو، اس مذہب کو ختم کرنا ضروری ہے، خواہ اس کے لیے گستاخی اور استہزاء کی تحریک ہی کیوں نہ اپنائی جائے۔ (۱۰)

اس کی اس کتاب سے جواب تک محفوظ ہے، پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی معلومات کے حصول کا دائرہ محض قرآن کریم تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس نے سیرت رسول سے بھی مدد لی جس کا اس نے لاطینی میں ترجمہ کروایا تھا۔

اس کتاب سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بغض و عداوت کے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی اور یورپ کی تمام زبانوں میں اس کتاب کے ذریعہ اور بھی لٹریچر تیار کیا گیا، کچھ لوگوں نے اشعار میں بھی اپنے ہفوات کو نظم کیا۔

ان لوگوں میں والٹرسینی (Walter Sens) بھی شامل ہے، جس نے لاطینی میں حیات رسول کو نظم کیا۔

۳- الیگزینڈر ڈیوبونٹ (Alexander Dupont) نے فرانسیسی زبان میں یہی کام کیا۔ (۱۱)

۴- ایک شعری مجموعہ امبریکو مینز (Embrico Mains) اور توسی ہیلڈ برٹ (Touss Hildbert) نے مرتب کیا۔

ان کا یہ شعری مجموعہ حیات محمد (Avita Mahamete) کے نام سے طبع ہوا، ایف ہو بنر

(F. Hubner) نے اس کی تحقیق کی اور اسے معروف رسالے Historicle Vicrteljaher Schft شمارہ ۲۴ سال ۱۹۳۵ (ص ۴۴۱-۴۹۰) میں شائع کیا۔ ۱۱۴۲ر اشعار پر مشتمل یہ شعری مجموعہ جھوٹی اور من گھڑت روایتوں سے پُر ہے، جیسے آنحضورﷺ کی مدد کے لیے ایک کسی مجہول جادوگر کی مدد کا ذکر۔ (۱۲)

والٹر سینی کا اوپر ذکر آچکا ہے، اس کے شعری مجموعہ کا نام (Otio de machomet) تھا اور اس کی لفظی تحقیق (RBc Heyens) نے کی اور اسے رسالے (Socric Frudiri) کے شمارہ ۸ سال ۱۹۵۶، ص ۲۸۵-۳۲۸ میں شائع کیا، اس کے اشعار کی تعداد ۱۰۹۰ تھی، اس قصیدے کا حال بھی حسب سابق تھا۔

۵-اسی دور میں پہلے صلیبی حملے کی تاریخ پر لکھی جانے والی مغربی کتاب (Gesta Dei Perfrancos) کے مولف گلبرٹ آف نوجنٹ (Guelbert of Nogent) نے رسول اکرمﷺ کی حیات طیبہ پر بھی ایک پوری فصل لکھی ہے۔ مگر مولف کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اسے آنحضورﷺ کا نام تک معلوم نہیں ہے، وہ آپ کو ماتھومس (Mathomus) لکھتا ہے۔ اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ اسے کوئی ایسا ماخذ نہیں ملا جس سے وہ رسول اکرمﷺ کے حالات لکھنے میں مدد لے سکتا، لہٰذا اس نے صرف ان روایات کا ذکر کیا ہے جو اہل مغرب زبانی طور پر ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہتے تھے، اسی طرح اسے آنحضورﷺ کے زمانے کا بھی صحیح علم نہیں اس نے اس راہب کا ذکر کیا ہے جسے کلیسا نے ناراض ہوکر نکال دیا تھا، اس نے کلیسا سے بدلہ لینے کے لیے نوجوان محمد کو تیار کیا (العیاذ باللہ) اسی نے آپ کو نیا دین پیش کرنے کے لیے آمادہ کیا اور آپ کی شادی ایک مال دار عورت خدیجہؓ سے کروائی۔ اسی طرح یہ خرافات بھی بیان کی کہ محمد نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ وہ عنقریب ایک معجزہ پیش کرنے والا ہے، اچانک ایک گائے آئی وہ محمد کے سامنے جھکی اور اس کے سینگوں پر ایک کتاب تھی، اس دن سے کسی کو بھی آپﷺ کی نبوت میں شبہہ نہ رہا۔

اس کی کتاب میں واحد بات جو صحیح تھی یہ تھی کہ مسلمان محمد کو نہ تو خدا مانتے ہیں اور نہ ہی ان کی عبادت کرتے ہیں۔

۶-اسی دور میں ایک شخص میتھیو برس نے گلبرٹ مذکور کی کتاب کو سامنے رکھ کر اسلام

اور پیغمبر اسلام پر کتاب لکھی۔

۷- اسی طرح جیکس دی وٹری (Jaques de Vitry) نے مسلمانوں کی ''ہدایت'' اور انہیں نصرانیت کی طرف لانے کے لیے ایک کتاب تصنیف کی، اس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق انتہائی گندی اور رکیک زبان استعمال کی۔ اس نے بڑی مشکل کے ساتھ آپ کے عہد کی تعیین کی اور مسلمانوں کے لیے پہلی مرتبہ دو ایسے الفاظ استعمال کیے جو صدیوں استعمال ہوتے رہے، ان میں ایک سارا سینی (Saraceni) منسوب بہ سارہ زوجہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرا ہاجرینی منسوب بہ حضرت ہاجرہ (زوجہ حضرت ابراہیمؑ) ہے۔

۸- اسی صدی میں دو اور ایسے مصنف سامنے آئے جنہوں نے آنحضور ﷺ کے متعلق کچھ مزید معلومات لوگوں کے سامنے پیش کیے، ان میں سے ایک ولیم آف مال میسبری (Wileam of malmesbury) اور دوسری پطرس الفونسی (Petrus Alponsi) تھا، انہوں نے مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کچھ صحیح حقائق پیش کیے۔ جیسے ولیم آف میسبری نے عام مغربی خیالات کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ مسلمان محمد کو خدا نہیں مانتے بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ محمد اللہ کے نبی اور رسول ہیں، ولیم نے یہ کتاب ۱۱۲۰ء کے قریب لکھی تھی۔

۹- پطرس الفونسی ہسپانیہ کا ایک یہودی تھا جو عیسائی ہو گیا تھا، اس نے ایک یہودی اور مسیحی کے مابین مکالمہ (Dialogue of a christian and a jew) لکھا جس میں بارہویں صدی عیسوی تک لکھی جانے والی کتابوں کی بہ نسبت اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بہتر معلومات ہیں۔

۱۰- عیسائی ولیم طرابلسی (William of Tripoli) نے ۱۲۷۱ء کے قریب ایک کتاب لکھی جس کا مقصد مسلمانوں میں تبلیغ کا کام کرنے والی مسیحی مہمات کی مدد کرنا تھا اس نے یہ تو بتایا کہ محمد ﷺ نے چالیس برس کی عمر میں دعوائے نبوت کیا اور آپ پر وحی حضرت جبریل کی وساطت سے آتی تھی لیکن ساتھ ہی اس نے کئی جھوٹی اور غلط باتوں کا بھی ذکر کیا جس میں کلیسا سے ناراض راہب کا ذکر خاص طور پر شامل ہے۔ (۱۳)

۱۱- آخر میں دانتے کا ذکر مناسب ہوگا جس نے ''الکومیدیا الالہیہ'' (۱۴) (Al-Comedia) کے نام سے کتاب لکھی۔

دانتے ۱۲۶۵-۱۳۲۱ء کے درمیان زندہ رہا، اس کو قرون وسطی اور نشاۃ ثانیہکے مابین ایک پل کا درجہ دیا جاتا ہے، دانتے نے سلطان صلاح الدین ایوبی کا ذکر دنیا کی بڑی شخصیات میں کیا ہے اور چھ مسلمان فلسفیوں بشمول ابن سینا اور ابن رشد کو جنت اور دوزخ کے درمیان میں دکھایا ہے جب کہ خاکم بدہن اس نے آنحضور ﷺ کو جہنم کے اٹھائیسویں درجے میں پیش کر کے اپنے خبث باطن کا اظہار کیا ہے۔ اور وجہ یہ لکھی کہ آپ العیاذ باللہ کنیسہ سے دشمنی رکھتے تھے اور آپ نے دین میں بدعت کی ابتدا کی گویا وہ آنحضور ﷺ کو ایک عیسائی سمجھتا تھا۔ اس سے اس کی خباثت وجہالت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۳- مغرب میں مطالعہ سیرت کا متاخر دور (تاانیسویں صدی عیسوی)

یورپ اپنی بیداری کے دور میں بھی اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے متعلق بدستور جہل مرکب، جھوٹے اور من گھڑت قصوں کا شکار رہا اور علمی اور فکری بیداری کے دعووں کے باوجود اس کی اس روش میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ (۱۴)

اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق لکھنے کے لیے ایک نئے ماخذ کا اضافہ ہوا، یہ ان لوگوں کی یادداشتیں تھیں جو صلیبی حملوں میں مسیحی لشکر کے ہمراہ مسلمانوں سے لڑنے اور ان سے القدس الشریف کو آزاد کرانے کے لیے گئے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود اکثریت تک ان کی رسائی نہ تھی (۱۵) یہ لوگ بڑی آسانی سے اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے تعصب اور خبث باطن کا اظہار کرنے کے لیے ان یادداشتوں کا ہی سہارا لیا۔

ان کی جہالت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ روشن خیالی کے دعووں کے باوجود اس دور میں بھی بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ محمد ﷺ العیاذ باللہ مسلمانوں کے خدا تھے اور مسلمان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ چنانچہ سولہویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں ایسی فرضی تصویریں پائی جاتی ہیں جن کو Mammentry کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ بتوں کی تزئین و آرائش کے لیے استعمال ہوتا تھا اور یہ دونوں الفاظ رسول اکرم ﷺ کے اسم مبارک ''محمد'' سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر جہالت اور خبث باطن کی اور کیا مثال ہوگی۔

اس دور میں بھی وہ گروہ موجود تھا جو یہ گمان کرتا تھا کہ محمد ﷺ عیسائی مذہب سے الگ

ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا ایک الگ بدعتی فرقہ بنالیا تھا، تاہم ان میں ایسا طبقہ بھی موجود تھا جو اسلام کو ایک مستقل دین اور مذہب قرار دیتا تھا لیکن آنحضور ﷺ سے کذب و فریب جیسے الزامات منسوب کرتا تھا۔ (العیاذ باللہ)

ہاں جو بات ان میں مشترک تھی وہ یہ کہ اسلام ہی ان کا دشمن اعظم ہے (۱۶)۔

اس زمانے میں یورپ پوری طرح ترکی کے حملوں کی زد میں تھا، سولہویں صدی کے وسط میں سلیمان القانونی کی ترک فوجیں (ویانا) تک جا پہنچی تھیں، اسی لیے بیداری کے دعوی کے باوجود ان لوگوں سے اسلام کے متعلق انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

تعصب بڑھنے کی ایک اور وجہ سولہویں صدی عیسوی میں مارٹن لوتھر کے تحت ابھرنے والی پروٹسٹنٹ تحریک بھی تھی، جس نے صدیوں کی پاپائیت اور کلیسائی جور و ستم کے خلاف آواز اٹھا کر اس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ کیتھولک لوگوں کا خیال تھا کہ پروٹسٹنٹوں کے عقائد مسلمانوں سے مشابہ ہیں حالانکہ پروٹسٹنٹوں نے ہمیشہ اس الزام کی تردید کی، مگر کیتھولک فرقہ نے پروٹسٹنٹوں کے طرز استدلال کو بھی "دشمن کبیر" یعنی مسلمانوں کے انداز استدلال سے مشابہ قرار دیا۔ چنانچہ انہوں نے اس دور میں یہ فیصلہ کیا کہ اپنی دشمنی اور نفرت کے اظہار کے لیے رسول اکرم ﷺ کے نام کے ساتھ کسی نامناسب لفظ کا اضافہ کر دیا کریں گے۔ (۱۷)

مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کا نیا دور اٹھارہویں صدی سے شروع ہوا، جب مغرب کے تین بڑے ممالک برطانیہ، فرانس، ہالینڈ نے تجارتی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے ارض مشرق خصوصاً اسلامی ملکوں کے ساتھ روابط پیدا کیے۔ ان ملکوں کی حکومتوں کی سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ و تعلیم کے لیے وسیع پیمانے پر مشنری تبلیغی سرگرمیوں کی ابتدا کے ساتھ اسلامی اور عربی کتب کا بڑا ذخیرہ مغربی کتب خانوں میں منتقل ہوا ، جن کے ترجمہ، مطالعہ اور تجزیہ کا نیا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ پیرس، لندن، آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ جامعات میں عربی شعبے قائم ہوئے۔ اسی دور میں قرآن کریم کے مختلف مغربی زبانوں میں ترجمے ہوئے، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں قرآن کریم کے ابتدائی تراجم ۱۶۴۹ء میں سامنے آچکے تھے۔

اس دور میں یورپ کے مصادر و مآخذ حسب ذیل ہوئے:

۱-مخطوطات جوان کے قومی ورثے کے طور پر لاطینی زبان میں موجود تھے۔

۲-عربی اور اسلامی کتب، اصل زبان میں یا کسی یورپی زبان میں ترجمہ۔

۳-مغربیوں کے سفرنامے جو مشرق کے مختلف ملکوں میں گئے۔

موخر الذکر میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اپنی تبلیغی اور دعوتی مہمات کے سلسلے میں مشرقی ممالک میں گئے تھے اور ان کے دل پہلے ہی تعصب اور جہالت کی بنا پر سیاہ ہو چکے تھے، اس لیے ان کے سفرناموں نے لوگوں کی جہالت اور تعصب میں اضافہ ہی کیا۔

۱- عہد بیداری میں بھی ''کبوتر'' والا قصہ جو العیاذ باللہ آنحضور ﷺ کے کان میں سرگوشی کرتا تھا بدستور مغربی ادب کا حصہ رہا، شیکسپیئر کے ڈرامے ہنری اول، ہنری دوم (ص ۱۴۰) میں یہ عبارت ملتی ہے:

کیا کبوتر نے محمد کو الہام کیا؟

تب تو تجھے پھر..........عقاب نے الہام کیا ہوگا۔(۱۸)

۲- شیکسپیئر سے پہلے انگریزی شاعر جان لیڈ گیٹ (John Lydgate) (م ۱۴۵۱ء) آنحضور ﷺ کا اپنی شاعری میں العیاذ باللہ ایک ماہر جادوگر اور ماہر فلکیات کی حیثیت سے ذکر کیا۔

۳-ہیگن (Hadgen) نامی شاعر نے بھی آنحضور ﷺ کی جادوگری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ آپ ﷺ نے جادو سے عرب کی مال دار عورت خدیجہ سے شادی کی۔دونوں کی جہالت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا نام اول الذکر نے گارڈیجان (Gardegan) اور ہیگن نے گاڈیجان (Gadigan) لکھا ہے اور یہ کہ وہ کورازان (Corazan) کے ملک کی ملکہ تھیں۔(۱۹)

لیڈ گیٹ نے اس کبوتر کو جو آنحضور ﷺ کے کان میں سرگوشی کرتا تھا، دودھ کے رنگ کی طرح سفید قرار دیا۔(۲۰) اور رسول اکرم ﷺ کی وفات کے متعلق بعینہ وہی داستان نقل کی جو قرون وسطیٰ میں رائج تھی۔

غرض علمی اور فکری بیداری کے اس دور میں جس بے باکی کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جھوٹ گھڑے گئے، اس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔

۴-بیکن نے بھی اپنے مضمون ''جرأت'' میں لکھا کہ:

''محمد نے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ وہ ان کے سامنے پہاڑ کو بلائے گا، جو ان کی بات سنے گا اور مانے گا، یہ سن کر بہت سے لوگ جمع ہوگئے، محمد نے کئی مرتبہ پہاڑ کو بلایا، مگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، یہ دیکھ کر محمد ذرا بھی شرمندہ نہ ہوا اور اس نے کہا کہ اگر پہاڑ محمد کے پاس نہیں آیا تو کوئی بات نہیں، وہ پہاڑ کے پاس چلا جاتا ہے (۲۱)۔ معروف انگریزی کہاوت If the mountain woluld not come to Mohommet, Mohoomet will go to the mountain. اسی فرضی اور جھوٹی قصے پر مبنی ہے''۔

۵- پروٹسٹنٹ تحریک کے بانی مارٹن لوتھر نے بھی ایک دوسرے انداز میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب اور نفرت پھیلانے کی کوشش کی، اس نے کہا کہ مسلمانوں کی ہدایت کا کوئی امکان نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے دل پتھر کے ہیں انہوں نے کتاب مقدس کو رد کیا ہے اور تمام دلائل و براہین سے انکار کیا ہے، لوتھر کے خیال میں اسلام صرف ترکوں کا دین ہے، جو یورپ کے لیے سیاسی اور فوجی پہلو سے خطرہ ہیں، اسی لیے امریکہ سمیت بہت سے یورپین ملکوں میں ترک کا لفظ ''مسلم'' کے مترادف تھا، لوتھر نے بھی اسلام کی مخالفت میں کمی نہیں کی۔

۶- ایک اور مغربی بدطینت شخص فلکٹن پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ گمان ظاہر کرتا تھا کہ محمد یا تو یاجوج تھے یا ماجوج یا پھر دونوں۔

۷- ۱۵۹۷ء میں ایک مجہول الاسم شخص نے ''سیاسۃ الامبراطوریۃ الترکیۃ'' کے نام سے کتاب لکھی جس میں اسلام اور اس کی اخلاقی مبادیات کے متعلق پہلی مرتبہ کچھ صحیح اور درست باتیں کہی گئیں۔ (۲۲)

لیکن مغرب میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے متعلق انتہائی متعصّبانہ کتب کی اشاعت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

۸- چنانچہ بیڈویل (Bedwell / م ۱۶۳۲ء) نے ایک کتاب ''محمد'' Mohamedis impostarae کے نام سے لکھی۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ کتاب کا موضوع کیا تھا۔ (۲۳)

۹- اسی طرح جینی برارڈ (Genebrard، ۱۵۳۵ - ۱۵۹۷ء) نے جو ایک مشہور کیتھولک مناظر تھا، اس بنا پر استہزاء کیا کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید کو عبرانی، یونانی یا لاطینی کے

مقابلے میں عربی میں لکھا اور یہ کہ العیاذ باللہ محمد ﷺ وحشی تھے اور اس زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے، جو ان کے وحشی مقاصد کو پورا کرسکے۔

۱۰- اسی سولہویں صدی میں ایک نامعلوم شخص نے ایک کتاب (دجالو العالم الثلاثۃ De Tribus Impostaribes کے نام سے (العیاذ باللہ) تحریر کی، جس میں اس نے حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ کا ذکر کیا، اس کے باوجود اس دور کے مسیحیوں میں یہ کتاب خوب پھیلی۔

سترہویں صدی عیسوی میں کچھ عربی کتابوں کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوا جس سے تعصب تو کم نہیں ہوا لیکن لوگوں کی اسلام کے متعلق معلومات بہتر ہونے لگیں۔

۱۶۴۹ء (۲۴) میں انڈری ڈوریئر (Andre Du Ryer) نے فرانسیسی میں اور کچھ عرصے کے بعد انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، عربی کی کئی کتابوں کے بھی انگریزی تراجم ہوئے۔

۱۱- برطانیہ میں مستشرق ایڈورڈ پوکوک (Edward Pococke) نے اور فرانس میں پٹیس ڈی لاکروکس (Petes de la croix) ہوئے۔ پوکوک آکسفورڈ (م ۱۶۹۱ء) میں عربی کی تعلیم دیتا تھا، وہ کچھ عرصہ شام میں بھی رہا تھا۔ اس نے ۱۶۵۰ء میں ابوالفرج العبری کی کتاب ''تاریخ مختصر الدول'' کا ترجمہ شائع کیا۔ العبری ایک عیسائی پادری تھا اور شام کے ایک کلیسا میں لاٹ پادری کے منصب پر فائز تھا، تیرہویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں اس نے مذکورہ کتاب تحریر کی، ترجمہ کا نام اس نے Spe cimen Historical Arabum رکھا۔ العبری مذکور کی کتاب کا رسول اکرم ﷺ کی ذات، ظہور اسلام اور اسلام کی اشاعت سے کوئی مرکزی تعلق نہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ تمام مباحث ضمنی طور پر زیر بحث آئے تھے۔ اسی لیے اس کتاب کے ذریعے اصلی ماخذ پر مبنی ایسا مواد سامنے آیا جو نسبتاً حقیقت کے قریب تھا، اسی لیے اسے مغرب میں عہد حاضر تک ایک اچھے ماخذ کے طور پر قبول کیا جاتا رہا ہے۔ (۲۵) اس میں آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ اور قدیم عربوں کی عادات کا بھی مختصر تذکرہ کیا گیا، پوکوک نے اس کے متعدد نسخے جمع کرکے پوری طرح تصحیح اور تحقیق کی، حواشی میں کئی فرضی قصوں کی تردید کی، مثال کے طور پر اس نے لکھا کہ معلق تابوت کے قصے پر مسلمان ضرور ہنسیں گے، اسی طرح اس نے کبوتر والے قصے کی بھی تردید کی۔ (۲۶)

۱۲- ۱۶۹۱ء میں ایک پادری لیوس مراکشی (Louis Maracci) نے قرآن مجید کا لاطینی میں ترجمہ کیا، جس کے ساتھ اسی نے ایک ضمیمہ بعنوان Prodromus alrefu Tation em Accorani شامل کیا، جس میں اس نے اسلامی مصادر کی مدد سے سیرت طیبہ کا بھی ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مسلمان مولفین کی کتب کو صحیح مانتا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ ''جب ہم اپنی کتابیں اپنے دشمنوں کے سامنے پیش کریں تو وہ طاقت ور اور قوی حجت والی ہوں'' اس کے باوجود اس پادری کی تحریر تعصب اور خباثت سے خالی نہیں تھی، اس نے آنحضور ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ نامناسب الفاظ کا اضافہ کیا، مجموعی طور پر اس کی یہ کتاب مناظرانہ ومجادلانہ انداز کی ہے۔ (۲۷)

اسی صدی میں ایک مصنف (Alexander Ross) نے دو کتابیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق تحریر کیں لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے کہ ان کتابوں کا مولف وہی ہے۔

۱۳- پہلی کتاب کا عنوان (A Brief Sketch of the life and death of Mahomet the Prophet of the Turks another of the Al-coran accompanying to the translation of the Koran) ہے۔ اس نے آنحضور ﷺ کے متعلق وہ تمام قصے اور جھوٹی کہانیاں جو قرون وسطی میں متداول تھیں، نقل کر دیں اور آنحضور ﷺ کے بارے میں انتہائی گھٹیا اور غلیظ زبان استعمال کی۔ (۲۸)

۱۴- دوسری کتاب کا عنوان پاندی بلیا (Pandeblia) ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا اس وقت تک دستیاب مآخذ کی مدد سے نسبتاً بہتر طریقے سے ذکر کیا گیا ہے اور یہ کتاب سابقہ کتب میں نقل کردہ فضول خرافات سے بھی خالی ہے۔

۱۵- اسی صدی میں ہوٹینجر نے اپنی کتاب تاریخ الشرق (Historia Orientlis) میں جو زورچ سے ۱۶۵۱ء میں طبع ہوئی، ایک مستقل فصل اسلامی اور کیتھولک تعلیمات کے مابین مشابہت دکھانے کے لیے مختص کی۔ اس نے چھٹی فصل میں اس الزام کی تردید کی ہے کہ پروٹسٹنٹوں نے اسلامی عقائد کو مسخ کیا ہے بلکہ یہ کہا کہ بیلرمن (Bellarmine) نے کیتھولک فرقے کے عقائد کی صحت پر جو دلائل دیے ہیں، وہ مسلمانوں کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔

۱۵- ہمفری بریڈوکس(Humphry Prideaux) نے جو ۱۶۹۷ء میں نوروچ(Norwich) کا ڈین تھا۔ سیرت طیبہ کے متعلق ایک کتاب لکھی جو برسوں تک مغربی مولفین کا اہم ماخذ رہی (۲۹) اس نے اس کتاب کا نام درج ذیل رکھا:

The true nature of imoprture fully displayed in the life of Mahomet, with a discaurse anien'd for the vindication of christianity from the charge of offered to the consideration of the peists of the present age.

اس کتاب کے ۱۶۹۷ء میں دو ایڈیشن چھپے، بعد میں اس کے کئی اور ایڈیشن طبع ہوئے اور فرانسیسی میں ۱۶۹۸ء میں اس کا ترجمہ شائع ہوا۔ (۳۰)

دراصل اسی زمانے میں ڈیسنٹ کے نام سے ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر تو عقیدہ رکھتا تھا لیکن وحی الٰہی، رسولوں اور آسمانی شریعتوں کا منکر تھا، ان دونوں فرقوں یعنی قدامت پرستوں اور ڈیسنٹ کے درمیان بحث و جدال کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک فرقہ دوسرے کو یہ الزام دیتا تھا کہ اس کے عقائد مسلمانوں کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔

مصنف نے یہ کتاب کلیسا کے فرقوں کے مابین ہونے والے تصادم کو رفع کرنے کے لیے لکھی تھی، مصنف کے خیال میں عیسائی فرقوں کی ان حرکتوں نے خدا کو ان سے ناراض کر دیا تھا اور ان پر مسلمانوں کو مسلط کر دیا گیا تھا، اس کی تالیف کا مقصد مذہبی ہونے کے ساتھ اسلام کی غلطیوں اور عیسائیت سے تناقض کو دکھانا تھا۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے کا عنوان ''حیات محمد'' ہے، یہ ۱۸۰۸ء کی طباعت کے ۱۱۱ صفحات پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ ڈیسنٹ کے الگ ہونے والے فرقے کے تعلق سے ۱۱۵-۳۰۷ صفحات کا ہے، تیسرا حصہ مصادر و مآخذ کی تفصیل پر ہے جس میں عربی، یہودی، کلدانی، یونانی، فرانسیسی اور انگریزی کتب سے استفادہ نے پورے یورپ میں بڑی شہرت بخشی۔

بریڈوکس نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کو قلم بند کرنا نہیں ہے بلکہ العیاذ باللہ حتی الوسع آپ ﷺ کی کذب بیانی کو بدترین صورت میں واضح کرنا ہے،

مصنف نے یہ تاثر دیا ہے کہ اس نے ۳۶ عربی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جن کے نام اس نے حاشیے میں درج کیے ہیں لیکن کتاب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس بدبخت اور شیطان صفت انسان نے ان کتابوں کے یورپی زبانوں کے صرف تراجم سے استفادہ کیا ہے اور خود مصنف کو عربی نہیں آتی (۳۱) اور اس کا منبع علم صرف تین چار کتابوں تک محدود ہے یعنی توماس لاینیوس کی تاریخ المسلمین (لائیڈن ۱۶۶۳ء)، ایڈورڈ پوکوک کی مختصر تاریخ العرب (آکسفورڈ ۱۶۶۳ء)(Contextis Gemarum) آکسفورڈ ۱۶۵۹ء اور تیسری کتاب المکین (Almakin) جسے عبرانی لاطینی میں اریپینیوس (Erpenius) نے ترجمہ کیا اور ابن العبری کی کتاب جس کا لاطینی ترجمہ پوکوک نے کیا۔

اس نے ترجمہ قرآن کے لیے روبرٹ انگلش مین (Robert the Englishmann) کے ترجمہ پر اکتفا کیا جسے اس نے بارہویں صدی عیسوی میں مکمل کیا تھا اور جسے بیبلیانڈر (Bibliander) نے شائع کیا تھا۔

۱۶- ڈچ مولف ایچ رولانڈ (H.Roland) کی کتاب De Religione Mahommediea کی صورت میں جو روترخت سے ۱۷۰۳ء میں طبع ہوئی، پہلی مرتبہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو تعصب کی بجائے اعتدال سے پیش کیا اور اس نے یورپ میں اس اصول کو متعارف کرایا کہ مشرق کو اس کے اپنے مآخذ کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلام جسے مسیحی مصنّفین نے انتہائی غلط انداز میں اور بگاڑ کر پیش کیا ہے اگر واقعی ایسا ہے تو وہ لاکھوں مسلمانوں کو متاثر کرنے میں کیسے کامیاب ہوا؟ (۳۲)

اس نے لکھا کہ جس طرح دین اسلام کی مخالفت کی گئی اور اسے بگاڑ کر پیش کیا گیا، ایسا کسی اور دین کے ساتھ نہیں کیا گیا اور اگر مسیحیت مسلمانوں کے ساتھ روابط رکھتی تو اسے بے حد فوائد حاصل ہوتے لیکن اس کتاب کو مغرب کے متعصب ماحول میں زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

۱۷- اسی زمانے میں ایک اور کتاب سامنے آئی، جو اس سے بھی زیادہ جرأت اور ہمت کے ساتھ لکھی گئی تھی، یہ کتاب کونٹ ڈی بولین ولرز (Count de Boulian Villers) نے ۱۷۳۰ء میں فرانسیسی میں لکھی اور اس کا اسی سال لندن سے انگریزی میں ترجمہ شائع ہوا، کتاب کا نام حیاۃ محمد

(Vie de Mohmet) تھا، مترجم نے اپنا نام پوشیدہ رکھا، مترجم نے کتاب لکھنے پر مولف کی جرأت کی تعریف کی ہے کہ اس نے محمد ﷺ کی شخصیت پر نئے انداز سے قلم اٹھایا ہے، اس کتاب کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اسلام ایک عقلی دین ہے اور اس نے اسی انداز سے آپ کی سیرت طیبہ کو قلم بند کیا۔ اس نے آنحضور ﷺ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی شخصیت منفرد اور ممتاز ہے، آپ ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے عظمت سے ابتدا کی اور عظمت کے ساتھ قیادت کی (۳۳) اور یہ کہ اسلام ایک دین فطرت ہے جو مسیحیت کا مقابلہ کرنے آیا ہے، اسلام ایک عقلی دین ہے اور رسول اکرم ﷺ دروغ گو نہیں تھے، مصنف اس بات پر خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام گوشہ نشین راہبوں اور عبادت گزاروں کا احترام کرتے تھے جب کہ یہ بات راہبوں اور عیسائی پادریوں کی سیرت کے بالکل خلاف ہے۔ مولف نے پوکوک اور دوسرے یورپین ماخذ سے استفادہ کیا۔

مغرب میں اس کتاب کا متضاد جملوں سے استقبال ہوا، ایک مصنف نے لکھا کہ یہ عیسائیت کی تحقیر کی قیمت پر، محمد ﷺ کی مبالغہ آمیز تعریف ہے، دوسرا مولف لکھتا ہے اس کتاب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے مسیحی یورپ میں مطالعہ سیرت رسول کے سلسلے میں مثبت نتائج پیش کرنے والی پہلی کتاب ہونے کا دعویٰ کرے۔ (۳۴)

اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف (۱۷۴۴ء) میں قرآن کریم کا ایک معیاری ترجمہ سامنے آیا جو سیل (sale) نامی مستشرق نے کیا تھا جو اب تک متداول ہے، اس میں مصنف نے بے شمار حواشی لکھے ہیں، اس نے مقدمہ میں رسول اکرم ﷺ اور قرآن کریم کے بارے میں کافی حد تک معتدل رائے ظاہر کی ہے، اس نے اوگستاس کے اس قول کو اپنا شعار بنایا ہے کہ "کوئی ایسا جھوٹا عقیدہ نہیں پایا جاتا جو کچھ حقیقی اشیاء پر مشتمل نہ ہو (۳۵)۔ اس مقدمہ کے لیے مولف نے پوکوک کے ترجمہ مختصر تاریخ الدول لابن العبری سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح اس نے گاگنیر (Gagnier) کے ترجمہ المختصر فی اخبار البشر لابی الفداء کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اس کے علاوہ اس نے بعض عربی متون کے لاطینی تراجم سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس نے آنحضور ﷺ کی تعریف میں کئی مسلمان مولفین کے اقوال نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ محمد ﷺ بت پرستی کو مٹانے کے لیے آئے تھے، یہ بھی لکھا کہ محمد ﷺ بڑے اعلیٰ اخلاق والے

اور چشم پوشی کرنے والے شخص تھے، تاہم وہ یہ کہنے سے باز نہیں رہا کہ العیاذ باللہ محمد ﷺ صادق نہ تھے اور اسلام سچا دین نہیں ہے۔

جین گاگنیر نے ۱۷۳۳ء اور ۱۷۴۸ء کے درمیان نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر دو بنیادی کتب شائع کیں جس میں سے پہلی ابوالفداء کی المختصر فی اخبار البشر تھی جو ساتویں صدی ہجری کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوائل کی ایک تصنیف ہے اور اس کا لاطینی ترجمہ بھی شائع کیا، اس طرح یورپ پہلی مرتبہ ایک مسلمان مورخ کے قلم سے آنحضور ﷺ کی سیرت و حالات سے واقف ہوا، پھر اس نے سیرت پاک پر ایک مفصل کتاب "حیاۃ محمد" لکھی اور اسے ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈم سے ۱۷۴۸ء میں شائع کیا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بولیفیلر کی کتاب کے اثر کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعریف پر مشتمل ہے، زائل کیا جائے۔

مصنف نے مقدمہ میں اپنی اعتدال پسندی کا ڈھنڈورا پیٹا ہے مگر وہ اپنی فطری خباثت، ذہنی فساد اور فکری گندگی کو زیادہ دیر تک روک نہیں سکا اور اس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق صدیوں سے مستعمل پادریوں کی زبان دہراتے ہوئے پیغمبر اسلام پر دشنام طرازی کی انتہا کر دی ہے۔(۳۶)

۲۴- اٹھارہویں صدی کے وسط میں ایک شخص سافاری نے قرآن کریم کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، یہ کام ۱۷۵۲ء میں مکمل ہوا، اس نے ترجمے کے ساتھ مختصر الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ بھی شامل کی ہے۔ وہ آنحضور ﷺ کو دنیا کے ان منفرد افراد میں شمار کرتا ہے جو انسانیت کی تاریخ میں ظاہر ہوئے اور جنھوں نے اپنے ادوار کو متاثر کیا (۳۷)، وہ آنحضور ﷺ کو ایک دانا اور عظیم سیاسی شخص قرار دیتا ہے، جنھوں نے حالات کی دگرگونی کے وقت ایک نیا دین پیش کیا۔ وہ اس بات منکر ہے کہ محمد ﷺ کو نبی کہا جائے، البتہ وہ آپ ﷺ کو دنیا کے عظیم ترین افراد میں شمار کرنے پر زور دیتا ہے۔(۳۸)

۲۵- اس تناظر میں جب معروف انگریز مورخ گبن لارڈ (Gibbon) نے ۱۷۸۰ء میں اپنی تاریخ Fall of the Roman Empire لکھی تو اسے اسلام اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے متعلق غلط اور بے ہودہ خیالات پیش کرنے سے اجتناب کرنا پڑا، تاہم اسے بھی پوکوک

اور سیل کی طرح متعصب عیسائیوں کی فہرست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اس نے اگر چہ اپنے آپ کو کسی حد تک متوازن رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی تحریر سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مصنف آنحضور ﷺ کو ''غیر صادق'' تصور کرتا ہے، مثال کے طور پر اس نے نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر بحث کی ابتدا اس قول سے کی ہے ''وہ عقیدہ جو اسلام کے نام سے معروف ہے اور جس کی شہادت محمد ﷺ نے دی اور جس کی طرف آپ نے اپنے خاندان اور اپنی قوم کو بلایا وہ ایک دائمی حقیقت سے ترکیب پذیر ہوا اور ایک ضروری جھوٹ پر مبنی ہے، یاد رکھو کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے''۔(۳۹)

اس کے ساتھ ساتھ وہ قرون وسطی میں آپ ﷺ کے متعلق پھیلی ہوئی بے سروپا کہانیوں کو بھی اپنی کتاب میں درج کرنے سے نہیں چوکتا، البتہ اس نے اسلام کے عقیدہ توحید کو اہمیت سے بیان کیا۔

غرض اس کی کتاب میں اعتدال اور مذہبی تعصب دونوں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہیں، اسی لیے یہ کتاب اس حوالے سے چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔

۲۶- اسی دور میں ایک فلسفی اور آزاد منش فرانسیسی وولٹر نے ۱۷۴۲ء میں (fanatismeou mohomet to prophete) مرتب کی، یہ کتاب کسی تاریخی ماخذ یا مصدر پر مبنی ہونے کے بجائے مولف کے ذاتی، شہوانی اور ناپاک خیالات کی عکاس ہے، اس بدبخت نے اپنی کتاب میں آنحضور ﷺ کے لیے العیاذ باللہ کوئی کلمہ خیر یا کلمہ احترام نہیں لکھا، وہ بولیفیللر اور سیل کے اس رویہ کی سختی سے مخالفت کرتا ہے کہ محمد ﷺ کا احترام سے ذکر کیا جائے (۴۰)، یہ کتاب اس نے پوپ بندیکٹ چہاردہم کو بڑے احترام کے ساتھ پیش کی تھی۔

یہاں یہ واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ علوم میں وولٹر کا ذکر ایک عظیم مفکر اور پاپائیت اور دین مسیحی کے سخت مخالف کی حیثیت سے کیا جاتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ انتہائی متعصب عیسائی اور رہبانیت کا ایک سیاہ دل غلام تھا۔

۲۷- اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت کا یہ جذبہ اس کی کتاب (Essai Sur moeurs) میں بھی کارفرما ہے جہاں وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ محمد ﷺ سے تعصب رکھتا ہے، اس

نے آنحضور ﷺ کا موازنہ کرومویل سے کرتے ہوئے کہا کہ محمد ﷺ کے کارنامے کرومویلکے کارناموں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں (۴۱)، وہ آپ ﷺ کو ایک عظیم شخص قرار دیتا ہے حتی کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی جو آپ کو صادق نہیں سمجھتے۔ (۴۲)

۲۸- معروف جرمن شاعر گوئٹے نے ۱۷۷۳ء میں اپنا ایک شعری قصیدہ بعنوان Mahomet Geseng لکھا، جس میں وہ رسول اکرم ﷺ کو ایک ایسی نہر سے مشابہت دیتا ہے جو مسلسل بہہ رہی ہے اور جس کا پانی ہر آن بڑھ رہا ہے اور یہ کہ آپ اپنے ہمراہ اپنے بھائیوں کو لیے ہوئے اپنے ابدی باپ کی طرف رواں دواں ہیں (۴۳)، کارلائل جس کا ذکر آئندہ آئے گا، اس نے گوئٹے کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے جس کا عنوان ''اگر یہی اسلام ہے'' تو کیا ہم اسلام میں نہیں جی رہے۔ (۴۴)

گوئٹے ابتدائی عمر میں مشرقی علوم وفنون میں گہری دلچسپی رکھتا تھا، چنانچہ اس نے ۱۷۷۱ء اور ۱۷۷۴ء میں رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر عدم فرصت کی بنا پر وہ اسے مکمل نہ کرسکا (۴۵)، گوئٹے کہتا ہے ''میں نے ایک خاکہ تیار کیا تھا کہ میں رسول کی سیرت لکھوں گا، جنہیں میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی غیر صادق نہیں سمجھا، اس لیے کہ آپ کا حقیقی زندگی کی طرف رویہ بڑا مثبت تھا''، گوئٹے کو یقین تھا کہ رسول اکرم ﷺ ابتدائی دنوں سے ہی بے حد مخلص اور صادق تھے۔ (باقی)

حوالے

(۱) دیکھیے The Christian approch to the Moslem A historical Study:J.T. Addison، کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک ۱۹۴۲ء، ص ۲۶۔ (۲) ایضاً۔ (۳) The Devolopment of Dublin Review, the Christian attitude to Islam,: Daniel Norman (موسم سرما ۱۹۵۱ء) eexxx، درص ۵۔ (۴) اس کی تفصیل اندلس کے تمام مورخین مثلاً ڈوزی وغیرہ نے دی ہے، شان اقدس میں گستاخی کی اس تحریک کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب ہر دور میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ذہنی اذیت دے کر اور خصوصاً اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بدزبانی کرکے ذہنی خوشی اور مسرت محسوس کرتا رہا ہے، موجودہ دور میں ڈنمارک اور ناروے کے گستاخان نبوت کا شجرہ بھی شاید اندلس کے ان ہی بدفطرت لوگوں کے ساتھ ملتا ہے۔ (۵) گستاف: حضارۃ الاسلام، عربی ترجمہ عبدالعزیز جاوید، قاہرہ ۱۹۶۰ء، ص ۸۱-۸۲۔ (۶) خدا بخش صلاح

الدین: Contribution to the History of Islamic civilization، بارسوم، ج ۱، کلکتہ یونیورسٹی کلکتہ، ۱۹۵۹ء، ص۱۸۲۔ (۷) ایضاً، ص۱۸۳۔ (۸) Daniel Norman، کتاب مذکور، شمارہ ۲۳۱، ۱۹۵۹ء، ص ۲۹۶۔ (۹) خدا بخش، کتاب مذکور، ص ۱۹۱۔ (۱۰) The Western attitude towards Islam During the Period of crusdes : Munro D.c اور Speculam، ج ۱، (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۱ء)، ص ۳۲۹-۳۳۷۔ (۱۱) Speculan اور The wester attitude towards Islam during the period of crusales: Munro D.C. (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۱ء)، ص ۳۲۹ - ۳۳۷۔ (۱۲) خدا بخش صلاح الدین، کتاب مذکور، ص ۱۹۱۔ (۱۳) ایضاً، ص ۲۰۴۔ (۱۴) Islam in English literature: Smith B.P.، امریکن یونیورسٹی، بیروت، پریس، ۱۹۳۹ء، ص۲۴۔ (۱۵) بارکی ف ج: نتاج التاریخی ومعالجۃ للشرقین الادنی والاوسط، درمورخوا الشرق الاوسط، تحریر برنارولوئیس ب م ہولٹ لنڈن، مطبعہ جامعہ اوکسفرڈ ۱۹۶۲ء، ص ۲۷۹۔ (۱۶) بحوالہ واٹ د،م: کارلائل، محمد، درصحیفہ ہیبرٹ، عدد ۵۳، شعبان ۱۹۵۳ء، ص ۲۴۹۔ (۱۷) Early on meehammad the historical Journal : LH Watt. Montgomry، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۲۴۹۔ (۱۸) Islam and the West Princeton Dian Nastran co: Hitti P.K.، ص۵۴۔ (۱۹) Smith BP، کتاب مذکور، ص۵۴۔ (۲۰) ایضاً، ص۲۔ (۲۱) فرانسس بیکن، المقالات والنصائح، نیویارک مطبع بیٹریاویز، ص ۴۹-۵۰۔ (۲۲) Addison، کتاب مذکور، ص۶۴۔ (۲۳) ایضاً۔ (۲۴) ایضاً۔ (۲۵) Daniel Normn، کتاب مذکور، ص ۲۹۵۔ (۲۶) Hitti, P.K، کتاب مذکور، ص ۵۴۔ (۲۷) Muhammadanism : Hurgronje e Snoudr، نیویارک، Putman's sons، ۱۹۳۶ء، ص۱۹۔ (۲۸) Smith، کتاب مذکور، ص ۲۹-۳۰۔ (۲۹) Hurgronje، کتاب مذکور، ص۱۸۔ (۳۰) The treatment of Arabic History by Priodox edited by Lewis Bernard and Held P.m and: Holt P.M sale, Historians of the Middle East، لنڈن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۲۳ء، ص۲۹۱۔ (۳۱) ایضاً، ص۲۹۰-۳۰۲۔ (۳۲) Hurgronje، کتاب مذکور، ص۲۰۔ (۳۳) Smith BP، کتاب مذکور، ص۵۵۔ (۳۴) Muhammad in Europe, A note on Western اور Interpretation of the life of prophet in: Sanders J.J history, The journal of historical association, N Series, xxxiv، فروری وجون ۱۹۵۶ء، ص ۱۶۔ (۳۵) Hurgronje، ص۲۳۔ (۳۶) ایضاً، ص۲۲۔ (۳۷) Muhammad, the man and his faith: Andrae Tor، ترجمہ T.Menzal ۱۹۳۶ء، ص۲۴۴۔ (۳۸) ایضاً، ص ۲۴۴ - ۲۴۵۔ (۳۹) Lifeof Mahomet: Gibbon Edward، امریکن بک ایکسچینج ۱۸۷۹ء، ص۷۲-۷۳۔ (۴۰) Andrae Tor، ص۲۴۵۔ (۴۱) Hitti, P.K، ص۵۹۔ (۴۲) Andrae Tor، ص۲۴۵۔ (۴۳) Watt, M، ص۲۵۲۔ (۴۴) Hitti, P.K، ص۹۵۔ (۴۵) Smith، ص۲۱۰۔

کلام المجذوب، مجذوب الکلام

جناب شمس الرحمان فاروقی

حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب علیہ الرحمہ کا نام ہر اس شخص نے سنا ہوگا جسے شعر و شاعری اور خصوصاً عارفانہ شعر و شاعری سے کچھ بھی دلچسپی ہے۔ متشرع گھرانوں میں بھی ان کا کلام ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ والد مرحوم اور میرے تمام خاندانی بزرگ حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کے مرید تھے۔ میرے دادا حکیم مولوی محمد اصغر صاحب نے اوایل زمانہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی سے تعلق قائم کیا۔ اور غالباً ۱۹۰۵ء میں حضرت کے وصال کے بعد حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کے حلقۂ ارادت میں آئے۔ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب چونکہ اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کے عاشق زار تھے۔ اس لیے ان کا ذکر میرے خاندان میں اکثر ہوتا تھا۔ اور ہر ذکر کے ساتھ ان کے عارفانہ کلام کا بھی تذکرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت مجذوب کے یہ اشعار بچپن سے میرے حافظے میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی — اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

دم بھر تو بھلا کوئی ہمیں جی کے دکھادے — کرلائے ہیں جس حال میں اک عمر بسر ہم

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے — گذروگے تو دنیا ہی سے جائیں گے گذر ہم

ارے اک نظر اس طرف بھی خدارا — بہ پاس مروت بہ نام محبت

لڑکپن میں ہم عشق کا کھیل کھیلے — وہ تتلا کے کہنا اے لے اے لے

مجذوب صاحب کے بارے میں دوسری بات جو بہت بچپن سے میرے کان میں پڑی

---

۲۹ سی ہیسٹنگ روڈ، الہ آباد، ۲۱۱۰۰۱۔

ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر تھے، لیکن اس خدشے کی بنا پر کہ کہیں خلاف شرع فیصلے نہ دینے پڑیں، انہوں نے اپنا تبادلہ محکمۂ تعلیمات میں کرالیا اور وہیں سے انسپکٹر آف اسکولس کے اعلیٰ عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔ لیکن یقین ہے کہ اگر وہ ڈپٹی کلکٹری نہ چھوڑتے تو کسی اور بھی بلند عہدے سے وظیفہ یاب ہوتے۔ ڈپٹی کلکٹری اس زمانے میں اگر بادشاہت نہیں تو نوابی ضرور تھی۔ اور شاید یہ بھی ممکن تھا کہ انسان ڈپٹی کلکٹر وغیرہ رہتے ہوئے پابندی شرع کے ساتھ زندگی گذار لے جائے۔ لیکن حضرت مجذوب کی طبیعت میں احتیاط اس قدر تھی کہ انہوں نے اتنی بڑی نوکری بخوشی چھوڑ کر کمتر درجے کی نوکری پر قناعت کی۔

یہ بات اپنی جگہ پر اہم ہے کہ انسان سید الانبیاء علیہ السلام اور ان کی شریعت سے اس قدر محبت رکھے کہ ہر ہر قدم پر حزم و احتیاط سے کام لے کہ کہیں کوئی قدم ذرا سا بھی جادۂ شریعت سے متجاوز نہ ہونے پائے۔ میں نے خود اپنے خاندان میں ایسی احتیاط کی مثالیں دیکھی ہیں۔ میرے والد مرحوم کے سب سے بڑے بھائی حاجی حافظ محمد طٰہٰ مرحوم جو حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کے خلیفۂ مجاز صحبت ہوئے، انہوں نے بھی پولیس محکمے کی کوتوالی چھوڑ کر کورٹ انسپکٹری اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ پولیس انسپکٹری اور کوتوالی کے زمانے میں، جیسا کہ عام طور پر طریقہ تھا، وہ بس یا ریل میں بلا ٹکٹ سفر کرلیا کرتے تھے۔ اب جب وہ تائب ہوئے تو سوچ کر ایسے تمام اسفار کی رقم کے برابر ٹکٹ خرید کر ضائع کیے تاکہ حقوق العباد کی ادائیگی میں کمی نہ رہ جائے۔

کی زبان سے سنے تھے۔ حضرت مجذوب کی شخصیت کا یہ پہلو انتہائی غیر معمولی ہے کہ ان کے مزاج میں عاشقانہ شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ سلوک کے معاملات کے بیان میں بھی شوخ اور عاشقانہ اور رنگین اسلوب اختیار کرتے تھے۔ شریعت کے معاملات میں ان کی حد درجہ احتیاط، اور شعریت کے معاملات میں ان کی حد درجہ مجذوبیت اور رنگینی ایک دوسرے کا جواب کہی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی ان کے احوال سے واقف نہ ہو اور ان کا کلام پڑھے تو اسے جگہ جگہ گمان گذر سکتا ہے کہ وہ جگر مرادآبادی کی طرح کے سرمست اور سرجوش شاعر کا کلام پڑھ رہا ہے، لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ جگر صاحب کے یہاں کئی اشعار زبان و بیان کی تمام خوبصورتی کے باوجود استناد کے درجے سے گرے ہوئے ہیں۔ اس کے برخلاف، مجذوب صاحب کا کلام پوری طرح استادانہ اور فنی لغزشوں اور عیوب زبان و بیان سے بالکل خالی ہے۔ زبان کی چستی، محاورے کی درستی اور روزمرہ پر قابو کے اعتبار سے ان کا کلام بیسویں صدی کے ربع اول کے کسی بھی استاد کے کلام سے کم نہیں۔ خواہ وہ عزیز و صفی ہوں یا یگانہ و حسرت، کسی کے بھی مقابل مجذوب صاحب کا کلام رکھ دیجیے تو سرمستی اور عاشقانہ محویت اور واردات نگاری کے اعتبار سے ان کا کلام برتر نکلے گا اور زبان و بیان کے اعتبار سے ان میں سے کسی کے بھی کلام سے کم تر نہ ٹھہرے گا۔

حضرت مجذوب نے اپنی زندگی حضرت سرور کائنات ﷺ کی محبت، اپنے شیخ سے مکمل ارادت اور اپنی شاعری سے مکمل مجانست کے ساتھ گذاری۔ شعر کہتے اور پڑھتے وقت ان پر جذب و حال کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی اس کی مثال اردو کیا فارسی شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اگر انہوں نے شاعری کو اپنے متصوفانہ مشاغل پر مقدم رکھا ہوتا تو ان کا نام آج بے تکلف بیسوی صدی کے نصف اول کے بڑے شعراء میں شامل ہوتا۔ ان کی پرگوئی اور بے تکلف غزل در غزل کہنے کے انداز ناسخ، آتش اور امیر مینائی جیسے اساتذہ کی یاد دلاتے ہیں۔ امرؤ القیس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قافیے میرے سامنے یوں ہیں جیسے کسی بچے کے سامنے ٹڈیوں کا دل کہ وہ ایک کو پکڑتا ہے تو دو ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔ بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ اشعار کی آمد کی حد تک مجذوب صاحب پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ان کا دیوان کہیں سے بھی کھولیے، پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے وہ جذب و مستی ہے اور پھر مکمل آمد کی کیفیت۔ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان اشعار کو نظم کرنے والا

وزن یا ردیف و قافیہ کی پابندی کا بھی قائل ہوگا۔ لیکن حقیقت ایسی ہی ہے۔ ان کی ظریفانہ نظم ''مسٹر اور ملا کی نوک جھونک'' ایک زمانے میں بہت مشہور ہوئی۔ اس میں کوئی چھ سو شعر ہیں اور زمین و بحر سودا کے ایک مشہور قصیدے کی ہیں۔ کہیں سے بھی صفحہ کھول لیجیے، حیرت ہوتی ہے کہ پردۂ نسواں کی حمایت جیسے آسان موضوع پر کوئی شخص علم اور خوش طبعی اور طنز کو اتنی خوبی سے اتنی طویل نظم میں نبھا سکتا ہے۔

عجب الٹی ہیں عقلیں اور عجب الٹا زمانہ ہے — کہ فوقانی تو تحتانی ہے تحتانی ہے فوقانی

سفید اب کرلیا ہے عورتوں نے بھی لباس اپنا — سراپا اب ہے خر مہرہ جو تھی یاقوت رمانی

یہی آخر میں بس طے ہے نئی دنیا کی ہر شے ہے — زباں کیوں اس کے درپے ہے کہ یہ قصہ ہے طولانی

ارے ثابت نہ کر بے پردگی میں دل کے پردے کو — چھپے گا چادر مہتاب میں کیا ماہ نورانی

غزل کی شاعری کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس میں دونوں طرح کے مضامین، یعنی عشق حقیقی پر مبنی مضامین اور عشق مجازی سے متعلق مضامین کو بیان کرنے کے لیے ایک ہی طرح کے استعارے، تراکیب اور الفاظ بکار لائے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان لہجے اور اسلوب کا نازک فرق اکثر برقرار رہتا ہے۔ ناتجربہ کار اور عدم احتیاط پسند طبیعتیں اس نازک فرق کو ملحوظ نہیں رکھتیں اور اسی وجہ سے شعر کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اردو کے مشہور انگریز عالم رالف رسل نے تو لکھا کہ غزل کا ہر شعر عارفانہ اور غیر عارفانہ تعبیر کا متحمل ہوسکتا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ لہجے اور اسلوب کی نزاکت ایک غیر مرئی حد فاصل ہے جسے وہی شاعر محسوس کرسکتا ہے اور اس کو ملحوظ رکھ سکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ غیر معمولی طور پر مشاق بلکہ فارسی اور اردو غزل کا پوری طرح مزاج شناس بھی ہو۔ حضرت مجذوب کے کلام میں ان کے تخلص کی مناسبت سے جذب اور از خود رفتگی تو ہیں ہی، لیکن اس کے علاوہ زبان کی صفائی اور احساس کی شدت اس قدر ہے کہ ان کے کلام میں بیک وقت کمال اور حکمت کی صفات پیدا ہوگئی ہیں۔

آج کل کے شاعر اس بات کو نہیں سمجھتے کہ شاعر کی ترقی کے دو مدارج ہوتے ہیں۔ پہلا درجہ حکمت کا ہے۔ جب شاعر علوم عقلیہ و نقلیہ میں یک گونہ مہارت حاصل کرلیتا ہے اور معاملات دنیا و دین کے باریک امتیازات کو سمجھنے لگتا ہے تو کہا جاتا تھا کہ اسے ''حکمت'' حاصل ہوگئی ہے۔

اس کے بعد دوسرا درجہ ''کمال'' کا تھا۔ یعنی جب شاعر اپنی وہبی اور اکتسابی حکمت کو شعر کی زبان میں ادا کرنے کے لائق ہوجاتا تو کہا جاتا کہ اب وہ ''درجۂ کمال'' کو پہنچ گیا ہے۔ پرانے کسی شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھ لیجیے، لوح تا تمت معیار میں یکسانی نظر آئے گی۔ میر کی عمر شعر گوئی ستر برس سے متجاوز تھی۔ لیکن ان کے دیوان اول میں جو حسن اور زور ہے، وہی ان کے دیوان ششم میں بھی ہے۔ کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ جن غزلوں نے غالب کو غالب بنایا، ان کی کم از کم ستر فیصد تعداد غالب نے اکیس بائیس برس کی عمر تک کہہ لی تھیں۔ میر انیس کے مراثی کو دیکھیے، یہ فرق کرنا غیر ممکن ہے کہ کون سا مرثیہ اوائل عمر کا ہے اور کون سا مرثیہ ان کے آخری زمانے کا۔ وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ میدان شعر میں تب اترتے تھے جب وہ ''حکمت'' اور ''کمال'' دونوں صفات سے متصف ہوچکے ہوتے تھے۔ آج کل کے شعرا کے دیوان دیکھیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اوائل عمر کی شاعری میں نومشقی اور خام کاری نمایاں ہے، اور شاعر کی عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں بھی اس کی صلاحیت کے موافق پختگی اور بہتری آتی رہتی ہے۔

حضرت مجذوب کا کلام شروع سے آخر تک یکساں ہے، اور اس اعتبار سے ان کے دیوان کو اساتذۂ قدیم کے دواوین سے مشابہ قرار دینا چاہیے۔ حیرت ہوتی ہے کہ معاملات سلوک، سرکاری نوکری کی ذمہ داریوں اور دنیا کے روزمرہ کاموں میں مصروفیت کے باوجود مجذوب صاحب کا کلام کہیں سے بھی نومشقی یا خام کاری کا پتہ نہیں دیتا۔ مشکل سے مشکل زمینوں میں طویل سے طویل غزلیں اور نعتیہ نظمیں بھی روانی اور شستگی میں سادہ روزمرہ پر مبنی غزلوں سے بالکل مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔ مثلاً یہ چند شعر ایک طویل دوغزلے سے لیے گئے ہیں۔ ردیف بظاہر آسان ہے لیکن قافیے نے اسے مشکل کردیا ہے ؎

جنون عشق یہ اللہ رے تیری یک رنگی — کچھ امتیاز بہار و خزاں نہیں ہوتا
ہمیشہ رہتا ہے اک عالم فنا طاری — میں زندہ ہوں مگر احساس جاں نہیں ہوتا

ان دونوں اشعار میں ردیف مذکر ہے (نہیں ہوتا) لیکن قافیہ مونث (خزاں، جاں) اور دونوں قافیے اس خوبصورتی سے نبھائے گئے ہیں کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کو نظم کرنے میں کیا کمال برتا گیا ہے۔ اب دو اور قافیے دیکھیے ؎

کہا جو میں نے کرم مہرباں نہیں ہوتا		کہا بگڑ کے اجارہ ہے ہاں نہیں ہوتا

شب وصال سرِ شام ہی سے رٹ ہے انہیں		یہ آج کیا ہے کہ وقت اذاں نہیں ہوتا

دوسرے شعر کی مضمون آفرینی قابل داد ہے لیکن قافیے بھی کیا خوب گل کھلا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہی ایک دوغزلہ ہے۔ جس کی دوسری غزل میں بارہ مطلعے ہیں اور سات شعر۔ قافیے پچھلی ہی غزل جیسے ہیں لیکن ردیف نہایت ٹھوس، یعنی ''تھا''۔ اب دو شعر دیکھیے۔

ہوئی تجویز وہ مٹی پئے خلق دل وحشی		کہ جس مٹی کے ہر ذرے میں مضمر اک بیاباں تھا

نمونہ راز وحدت کا مرا حال پریشاں تھا		کہ مشکل امتیاز دامن و جیب و گریباں تھا

یہ قافیے عام طور پر اتنی صفائی سے نہیں بندھ سکتے خاص کر کہ جب مضمون اس قدر باریک نکات عشق پر مبنی ہو۔ میر کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

پھوٹا کئے پیالے لنڈھتا پھرا قرابہ		مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا

میر کی غزل ان کے زمانۂ نوجوانی کی ہے اور اس کے بعض شعر زباں زد خلائق ہیں۔ لیکن اسی بحر میں اور مطلعے ہی کے رنگ کے چند شعر مجذوب صاحب کے ملاحظہ ہوں۔

محفل میں تیری سب کے ارماں نکل رہے ہیں		سالک ابل رہے ہیں مجذوب اچھل رہے ہیں

دیکھ اہل ضبط مطرب پہلو بدل رہے ہیں		کوہ گراں بھی اپنی جگہوں سے ٹل رہے ہیں

ہم اس گلی میں اے دل چلنے کو چل رہے ہیں		ادنیٰ خطا پہ لیکن عاشق نکل رہے ہیں

عشاق تو ہوئے ہیں پروانہ وار سوزاں		مانند شمع وہ بھی محفل میں جل رہے ہیں

تم دیکھنا یہ چپ بھی لاتی ہے رنگ کیا کیا		سانچے میں میرے دل کے مضمون ڈھل رہے ہیں

مجذوب نے جو بڑ میں دو لفظ بھی نکالے		برسوں وہ سالکوں میں ضرب المثل رہے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مجذوب صاحب نے دنیا کے سامنے خود کو شاعر کے طور پر پیش کیا ہوتا تو اس غزل کے بھی کئی اشعار ضرب المثل ہو جاتے۔ میر نے بھی شاید اسی کیفیت سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو		مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

پھرتے ہیں چنانچہ لیے خدام سلاتے		درویشوں کے پیراہن صد چاک قصب کو

مصلح امت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ پر اکثر حالت جذب طاری رہتی تھی اور اس عالم میں وہ رقصاں ہو جاتے اور عارفانہ کلام پڑھتے تھے۔ ان کے ایک مرید کے دوست ان کی اس خصلت کا مذاق اڑاتے تھے اور جب ملاقات ہوتی تھی تو یہ فقرہ ضرور کہتے تھے کہ ''تمہارے نچنیا پیر کیسے ہیں؟'' وہ اس بات پر بہت آزردہ ہوتے لیکن خاموش رہتے۔ لیکن ایک بار تنگ آ کر انہوں نے شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا حضرت وہ صاحب ایسا ایسا کہتے ہیں، میں کیا کروں؟ شیخ نے جواب دیا کہ ''اچھا اب کی بار پوچھیں تو جواب دے دینا کہ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی نچاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں''۔ مرید صاحب نے ایسا ہی کیا اور شیخ نے وہ فقرہ کچھ اس جذب وتوجہ کے عالم میں کہا تھا کہ مرید صاحب کے دوست پر بھی وہی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ خودسر بازار رقصاں ہو کر شیخ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت مجذوب کا کلام پڑھئے تو جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کیفیت جذب وشوق کہ ''کوئی نچاتا ہے تو ہم ناچتے ہیں'' کا اظہار دیوان میں عجب عارفانہ قوت کے ساتھ ہوا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

جب کسی سے لو لگالی جائے گی تب یہ آشفتہ خیالی جائے گی
زاہدوں پر مے اچھالی جائے گی جان ان مردوں میں ڈالی جائے گی
بے سوالی کی نہ خالی جائے گی دل کی بات آنکھوں سے پالی جائے گی
لاکھ ہو بحر محبت پر خطر کشتی دل اس میں ڈالی جائے گی
یاد تیری بڑھتے بڑھتے ایک دن تابہ حد بے خیالی جائے گی

جناب مجذوب کا ذکر نکلے تو یہ ممکن نہیں کہ ان کے کلام کے ایک مداح اور بقیۃ السلف شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب المتخلص بہ احمد پرتاپ گڑھی کا ذکر نہ آئے کہ وہ خود بھی عارفانہ شعر گوئی میں اعلیٰ ترین مرتبے کے استادوں میں شمار ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ مدت ہوئی میں نے حضرت کے مجموعۂ کلام ''عرفان محبت'' پر اپنی حقیر تحریر میں لکھا تھا کہ حضرت احمد پرتاپ گڑھی کا کلام بظاہر فنی پیچیدگیوں سے عاری ہے اور بے پناہ آمد کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ حضرت مجذوب کے یہاں بھی بے پناہ آمد کا تاثر ہے لیکن ان کی شوخی طبیعت انہیں غزل کی رنگینیوں کی کئی راہوں کی

سیر کراتی ہے۔ حضرت مولانا احمد پرتاپ گڑھی کے یہاں کیفیات وواردات کا براہ راست بیان ہے۔ اس بنا پر قاری یا سامع کیفیات کے لطف یا علوے مرتبت میں گم ہوجاتا ہے اور شعر کی فنی نزاکتوں کی طرف فوراً متوجہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آپ کا شعر ہے۔

عجب کچھ شان دیکھی میں نے بیمار محبت میں اسے نسیان کامل غیر سے واللہ ہوتا ہے

اس شعر میں لفظ ''غیر'' کے ساتھ ''واللہ'' عجب لطف رکھتا ہے، کیونکہ نسیان کامل تو غیر سے ہے اور توجہ پوری الی اللہ ہے۔ ایسے موقع پر اللہ کی قسم کھانا کمال بلاغت ہے۔ حضرت مجذوب کے یہاں مغلوب الحالی کی کیفیت ہے جس بنا پر ان کے شعروں میں حضرت احمد پرتاپ گڑھی کے اشعار کی سی باریکی کم نظر آتی ہے۔ حضرت احمد کے یہاں فنا فی اللہ سے لے کر سیر فی اللہ تک کے مراتب اس قدر سادہ بیان میں نظم ہوئے ہیں کہ جگہ جگہ حضرت شاہ نیاز بریلوی کی یاد آتی ہے۔ مثلاً ان کے ساقی نامے کے کچھ شعر ہیں۔

مقام عشق ہے سمجھے گا اس کو رازداں ساقی میں وہ میخوار ہوں جس کا ہے اب سارا جہاں ساقی

سناتا میں بھلا کیا عشق کی یہ داستاں ساقی پس پردہ کوئی رہتا ہے ہر دم نغمہ خواں ساقی

کوئی اس لطف کو احمد سے پوچھے کوئی کیا جانے کبھی ہے میہماں ساقی کبھی ہے میزباں ساقی

ان دونوں حضرات کے یہاں جلووں کی جو فراوانی ہے وہ بیشک اللہ کے کرم اور ان بزرگوں کے فیض کے باعث ہے جن سے انہیں تعلق رہا ہے۔ حضرت مجذوب سے ایک صاحب نے جب اصلاحی تعلق قائم کرنے کی درخواست کی تو آپ نے کیا عمدہ بات کہی کہ۔

انچہ مردم می کند بوزینہ ہم نقل ارشادات مرشد می کنم

نقل سے بھی ہو وہی فیض اتم اصل کی برکت سے لیکن کیا عجب

اللہ سے دعا ہے کہ یہ چند ژولیدہ کلمات جو میں نے ان دو بزرگوں کی شان میں رقم کیے اور اس غرض سے ان کے اشعار نقل کیے تو اصل کی برکت اس نقل میں بھی آجائے۔ آمین۔

مولانا عبدالحئی احقرؔ بنگلوری

جناب علیم صباؔ نویدی

دکن اور اردو کا رشتہ اس قدر قدیم اور مسلم ہے کہ اس کے ثبوت کے لیے تاریخی حوالہ جات کی بھی گویا اب ضرورت نہیں ۔ اس موضوع پر تاریخ ادب اردو کے بیشتر محققین اپنی پوری ذہنی توانائی صرف اور روشنائی خشک کر چکے ہیں ۔ تاہم قندِ مکرر کے طور پر کچھ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) کے مشہور سپہ سالار ملک کافور نے ۱۳۰۹ء میں سب سے پہلے کرناٹک فتح کیا اور علاؤ الدین کی وفات (۱۳۱۷ء) کے بعد دوبارہ محمد بن تغلق نے ۱۳۶۱ء میں کرناٹک پر فتح و کامرانی حاصل کی تو اس کے فوجیوں کے ہمراہ مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ ابتدائی اردو زبان بھی سیاسی ، تجارتی اور لشکری مقاصد کے تحت شمالی ہند سے کرناٹک میں داخل ہوئی ۔ اس دور میں شمال اور کرناٹک کے تعلقات میں بہت وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی گئی ۔ بالخصوص ۱۴۰۰ء میں جب سلطان فیروز شاہ بہمنی نے وجیا نگر کی شہزادی سے شادی رچا کر دو سلطنتوں کے درمیان تعلقات استوار کیے تو وجیا نگر کی حکومت میں مسلمانوں کو ملازمتیں بھی ملیں ۔ اس اختلاط کی وجہ سے اردو زبان کے بولنے والے کرناٹک کے مختلف مقامات پر پھیلتے چلے گئے ۔

۱۴۹۰ء - ۱۶۸۶ء کے دوران بیجا پور میں عادل شاہی اور ۱۵۰۸ء - ۱۶۸۷ء کے دوران گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومتیں قائم رہیں ۔ ۱۵۶۵ء میں تالی کوٹ کی جنگ کے بعد علاقہ کرناٹک میں مسلمان حکومتوں کا پہلے کی بہ نسبت اثر و نفوذ اور مستحکم ہوا ۔ اس عام رجحان اور عمومی اثرات سے میسور کا علاقہ مستثنیٰ نہیں تھا ۔ چنانچہ ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد کے قیام سے پہلے کرناٹک میں

مدیر اعلیٰ ''نور جنوب'' چنائی ۔

شعراء، ادباء اور علماء نے اردو زبان کی ترقی اور نشو ونما میں بطور خاص توجہ دی۔ جن میں شمالی ہند، ترکستان، ایران اور عرب کے اہل علم وکمال کے علاوہ خود کرناٹک میں ملک الشعراء نصرتی بیجاپوری، ہاشمی بیجاپوری، عبدالمومن مومن (۱) (عادل شاہی دور کا آخری شاعر) اور شاہ محمد صدرالدین (۲) فرزند میراں شاہ ولی اللہ (المتوفی ۱۱۴۶ھ مدفون آدم پہاڑی، ضلع شمالی آرکاٹ) قابل ذکر ہیں۔

قیام سلطنت خداداد کے بعد عہد حیدری (۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۲ء) میں محمد سعید عاصی المتوفی ۱۷۵۳ء، سید محمد شاہ میر المتوفی ۱۱۸۹ھ، خیراللہ شاہ قادری خادم، فضل اللہ فقیر (۳)، سید حسین علی شہباز، احمد خان شیرانی (۴)، لالہ مہتاب رائے سبقت (۵) اور محمد مخدوم شاکر وغیرہم نے اردو کے شعری سرمایہ میں قابل قدر اضافے سے اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شمالی ہند میں آبرو (المتوفی ۱۷۳۳ء)، فائز دہلوی (المتوفی ۱۷۳۸ء) اور خان آرزو (المتوفی ۱۷۵۶ء) کا دور ختم ہو چکا تھا اور حاتم (المتوفی ۱۷۸۳ء)، میر درد (المتوفی ۱۷۸۴ء)، مرزا رفیع سودا (المتوفی ۱۷۹۸ء) اور قلندر بخش جرأت (المتوفی ۱۸۰۹ء) اردو شعر وادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بنے ہوئے تھے۔

دور ٹیپو سلطان (۱۷۸۲ء تا ۱۷۹۹ء) میں زین العابدین (۶) (میر منشی ٹیپو سلطان)، حسن علی عزت (۷)، سید عارف شاہ قادری (۸)، میر حسن علی کرمانی حاکم (۹)، شاہ کمال الدین کمال (۱۰)، محمد علی مہکری خانہ زاد (۱۱)، محمد اسحاق (۱۲) اور عبدالحق (۱۳) جیسے شعراء، ادباء، اہل علم اور اصحاب فضل نے اپنی تصنیفات اور تالیفات کے ذریعہ اردو شعر وادب کے ایک چھوٹے سے علاقے کے حدود کو خاطر خواہ وسعت بخشی۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا زمانہ بہت مختصر سہی پھر بھی اس عہد میں اردو زبان کے شعر و ادب اور علم وفن کی سرپرستی اور قدر دانی بہت زیادہ ہوئی۔ حالاں کہ اس عہد کی دفتری زبان فارسی تھی، لیکن ٹیپو سلطان کی جامع الصفات اور علم دوست شخصیت کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ موصوف نے اپنے دور میں مذہبی تعلیم کے ساتھ دوسرے اور علوم وفنون مثلاً فلسفہ، ریاضی، نجوم، طب کی تعلیم وتدریس کے لیے سری رنگپٹن میں ''جمیع الامور'' نامی درس گاہ قائم کی۔ سلطان کو مختلف علوم وفنون پر دست گاہ حاصل تھی، تصنیف وتالیف سے بھی تعلق تھا۔ اسی طرح راجگانِ میسور

نے بھی اردو زبان کی بھرپور سرپرستی کی ۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء کے بعد مہاراجہ کرشنا راج ووڈیار اور اس کے متبنیٰ چامراج وڈیار (تخت نشینی ۱۸۶۸ء) کے عہد میں بھی اردو کی ہر دل عزیزی اوج پر تھی ۔ اس دور کے معروف ادباء وشعراء میں میر حیات میسوری (۱۴)، (وفات ۱۸۶۴ء)، سید عبد اللطیف لطیف آرکاٹی (۱۵) (وفات ۱۸۷۶ء)، محمد قاسم غمؔ (۱۶) (وفات ۱۸۶۱ء)، محمد حسین نسیم (وفات ۱۸۸۸ء) (۱۷)، محمد عبدالرحمان دلؔ (وفات ۱۸۹۹ء)، عبدالحق تحقیقؔ (۱۸) (وفات ۱۹۰۰ء)، عبدالحفیظ آرامؔ (۱۹)، سید شہاب الدین شہابؔ (۲۰) (وفات ۱۹۰۵ء)، محمد غوث جادوؔ (۲۱) (وفات ۱۹۰۷ء)، بڈھن شریف آثم (۲۲) (وفات ۱۹۱۸ء)، منشی قلندر حسین اطہرؔ (۲۳)، مولانا عبدالقادر علی صوفیؔ (۲۴) (وفات ۱۸۹۶ء) فرزند مولانا عبدالحق احقرؔ بنگلوری، عبداللہ مستانؔ (۲۵) (وفات ۱۹۱۳ء) اور مولانا شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلوری (وفات ۱۸۸۲ء) قابل ذکر ہیں ۔ ان سب میں علم وفضل اور شرف وکمال کے اعتبار سے جو مقام ومنزلت حضرت مولانا عبدالحیٔ احقرؔ بنگلوری کو حاصل ہوا وہ دوسروں کے حصے میں کم آیا۔

حضرت احقرؔ نے مختلف علوم وفنون بالخصوص اردو زبان وادب کی اشاعت وترویج میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس طرح صرف کیا کہ ان کی بدولت اسلامیات کا خاصا اہم ذخیرہ اردو نظم ونثر میں منتقل ہوا۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ بعض اوقات کسی مصنف کی کتابیں اس قدر مشہور ہوجاتی ہیں کہ ان کی روشنی کے آگے قاری کو صاحب تصنیف کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی ۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا عبدالحیٔ احقرؔ بنگلوری کے ساتھ بھی پیش آیا۔ کثیر التصانیف شاعر و ادیب ہونے کے باوجود ان کی زندگی کے مفصل حالات اور فن وشخصیت کے خدوخال زیادہ واضح نہیں ہوسکے۔ اپنے دور کے شعلہ بیان مقرر، معتبر مفسر، مستند محدث، مورخ، صاحب طرز سوانح نگار اور انشاء پرداز کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشنی میں لانے کا شرف میسور کے ممتاز محقق مولانا ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کو حاصل ہے۔ جنہوں نے حضرت مولانا عبدالحیٔ الحسنی مصنف ''نزہۃ الخواطر'' کے بارے میں نہایت وقیع اور مفید محققانہ کام کیا ہے۔ انہوں نے شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلوری پر بھی بڑی عرق ریزی، جاں فشانی اور ژرف نگاہی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے تحقیق اور تالیف کا حق ادا کیا ہے۔ تاہم کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی ،اس میں بہت

کچھ اضافوں اور گنجائشوں کو نئی راہیں ملتی رہتی ہیں اس لیے راقم الحروف نے بھی مولانا عبدالحئ احقرؔ (واعظ بنگلوری) پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے کی جسارت کی ہے۔

سلطنت خداداد کی تباہی کے بعد انگریزوں کا ظلم وستم عروج پر پہنچا تو کئی معزز مسلم خاندان اس کی زد میں آئے۔ حضرت مولانا احقر بنگلوری کے آباواجداد مغل شہنشاہ شاہجہاں کے دور سے سلطنت خداداد تک بہت اہم اور اعلی منصبوں پر فائز تھے۔ ان کے والد ابراہیم بیگ تریکیرا (Terikira) کے عمل دار تھے۔ دادا گلان دُرگ کے پردادا قادر علی بیگ اعظم پور کے عمل دار تھے۔ ان کی والدہ کا سلسلہ نسب سات گڈھ بمقام پیاری بیگم پیٹ (۲۶) شمالی آرکاٹ کے مشہور صوفی بزرگ شاہ آدم تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد زوال سلطنت خداداد کے بعد اپنے فوجی منصب سے معزول ہوکر سسرال بنگلور آئے، جہاں حضرت احقر کی ولادت ۱۸۱۸ء میں ہوئی۔ ماحول دینی اور علمی ملا۔ والدین سے جہاں دادیہال کی بہادری، شجاعت اور جواں مردی کے واقعات سنے وہاں نانیہال کے صوفیانہ رنگ ومزاج، تقویٰ اور پرہیزگاری سے بھی باخبر ہوئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عہد طفلی ہی سے ان میں ہمت اور دلیری کے ساتھ علم وعرفان، زہد وتقویٰ، جذبۂ دین داری اور حمیت اسلامی کی خوبیاں آگئیں۔ ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہوئی۔ بعد میں وہ بنگلور کے ایک مشہور عالم باعمل حضرت سید شاہ سجاد شطاری کے دامن تلمذ سے وابستہ ہوئے۔ موصوف کے دامان تربیت میں ان کی شخصیت کے نقوش خوب نکھرے اور یہیں سے ان کو علوم وفنون کا صحیح ذوق عطا ہوا۔ بنگلور میں رہ کر علوم ظاہری سے فراغت حاصل کرلی تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ویلور (ضلع شمالی آرکاٹ) کا رخ کیا۔ اس دور میں ویلور میں حضرت سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری (المتوفی ۱۲۸۹ھ) کی ذات اقدس، علم وعرفان کا مرکز بنی ہوئی تھی، تشنگان علوم وفنون کے لیے ان کی خانقاہ، چشمہ نورانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت عبدالحئ (۲۷) احقرؔ بنگلوری جب حضرت قطب ویلور کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تو شیخ کامل کی نگاہ دوررس نے اس نوجوان، ہونہار اور قابل طالب علم کے باطن میں پوشیدہ جوہر نایاب کا سراغ لگایا نتیجے میں احقر بنگلوری کا ذوق معرفت اور اشتیاق راہِ حقیقت آہستہ آہستہ رنگ لایا، جس کا اظہار بڑی والہانہ عقیدت کے ساتھ یوں کیا ہے ؎

خصوصاً شیخ میرا قطب اشہر　　یقیں اس عصر کا ہے شیخ اکبر
یقیں ایسے ہیں اخلاقِ جمیلہ　　ہیں بے حد اس کے اوصاف جمیلہ
سمجھ عبد اللطیف اس کا ہے نام　　لقب ہے محی الدین اے نیک انجام
ہے وہ فرزند سید بو الحسن کا　　ہے پوتا محی الدین قطب زمن کا
(سرالشہادتین: مطبوعہ ۱۳۰۲ھ)

''جنان السیر'' کے دوسرے چمن میں فرماتے ہیں ؎

خاص کر شیخ مرا قطب زماں　　شیخ فیاض ہے در سر و عیاں
شہر ویلور سے لے تا بعرب　　مستفیض ہیں اس ایک عالم اب
ہر جگہ اس کے فیوض و ارشاد　　شرک و الحاد کی توڑے بنیاد
علم ظاہر میں ہے مدقق فاضل　　علم باطن میں ہے محقق کامل
عالم و حافظ قرآنِ کریم　　عارف و سالک و فرزانہ حکیم
چرخِ عرفاں کا ہے بدرِ منیر　　ملک وجدان کا ہے شیخ کبیر
بالیقیں جس کا مقدس سینہ　　ہے حقائق کا عجب گنجینہ
عارف عصر ہے ایسا ذی شاں　　خوشہ چیں جس کے ہیں عرفائے زماں
ہے نسب میں وہ حسینی زِ پدر　　اور حسنی ہے زِ سوئے مادر
باصفا عبد اللطیف اس کا نام　　محی الدین ہے ملقب وہ ہمام
بو الحسن والد امجد اس کا　　محی الدین قطب زمن جد اس کا
دیرگاہ اس کو رکھے رب انام
مہتدی اس کے مریدوں کو تمام

''چہار گلشن'' بھی مولانا کی اہم کتاب ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے شیخ کی مدح سرائی یوں کی ہے ؎

شکر للہ دریں زمانِ اخیر　　فرد ایسا ہے ایک میرا پیر
شیخ الشیاخ سید السادات　　ذو الکمالات منبع برکات

مجمع سیرت حسینؓ و حسنؓ خلف بو الحسن شہید امن

علم ظاہر میں فارغ التحصیل علم باطن میں صاحب تکمیل

جامع علم ظاہر و باطن معدن فیض بار زر کامن

ہے شریعت میں عالم و عامل اور طریقت میں واصل موصل

قطب ویلور سے جو ہے مشہور ذات اس کی ہے ایک منبع نور

ایک عالم مرید ہیں اس کے علم باطن اسی سے ہیں سیکھے

معتقد اس کے ہیں خواص و عوام کیا امیر و فقیر با اکرام

موشگافی ہے اس کو عرفاں میں نکتہ یابی کمال وجداں میں

سر و ظاہر میں ہے غرض یکتا پیشوا ہے وہ دین و ملت کا

ہے حمایت میں دیں کے سر و عیاں محی الدین ہے اسے لقب شایاں

زہد و تقویٰ میں اور توکل میں جود و بخشش میں اور تبذل میں

حق نے بخشی ہے اس کو شانِ جلیل کوئی اس عصر میں نہ اس کا عدیل

ذکر مولا میں صبح سے تا شام ہے اسے اطمینان اور آرام

دائماً اس کی محفل پُرنور ذکر مولا سے ہے یقیں معمور

جب تلک بیٹھیں اس کی محفل میں خوف حق تب تلک رہے دل میں

ذکر مولا سے دل کو اُنست ہو اُنست و چین اور لذت ہو

پیشتر اس کی محفل انور ! ذکر دنیا سے دور ہے اشہر

اس کی محفل ہے موردِ رحمت اس کی صحبت ہے دافع غفلت

اس کی مجلس دلادے یادِ خدا اس کی صحبت دکھا دے راہِ خدا

اس کی صحبت ہے کیمیا تاثیر زر کرے مس کو پل میں بے تاخیر

یا الٰہی اسے سلامت رکھ !
اس کو فیاض تا قیامت رکھ

قطب ویلور کے فیوض و برکات سے متعلق فرماتے ہیں۔

جودت طبع تھی اس کی رسا اور تھا نیز اس کا فہم و ذکا
ہوا مائل مطالعہ کی طرف تھوڑی مدت میں ہی وہ کانِ شرف
عربی معتبر کتب پہ تمام ہوا حاوی بفضلِ ربِ انام
سب پہ قادر کیا اسے قادر ہوا ہر فن میں وہ بڑا ماہر
اور تصوف کے سب رموز دقیق اپنے والد سے کرچکا تحقیق !
ہوا یکتا دلیل و برہاں میں اور کشف و شہود و عرفاں میں
اس کا کوئی سمجھ عدیل نہ تھا کوئی اس ملک میں مثیل نہ تھا
بس اسی فن میں وہ گرامی تھا ثانیٔ جامؔی و نظامؔی تھا

یہ نہیں ہے مبالغہ اے یار
واقعی ہے یہ بات بے تکرار

مولانا احقؔر بنگلوری بہ فیض قطب ویلور نہ صرف اپنے دور کے عالم باعمل، صوفی باصفا بنے بلکہ صاحب دل شاعر وادیب کی حیثیت سے شہرت اور نیک نامی سے سرفراز ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ کی منظوم سیرت "جنان السیر" (جو دس باب میں منقسم ہے) تحریر فرمائی جسے ڈیڑھ سو سال سے آج تک جنوبی ہند بالخصوص کرناٹک اور مدراس کی اکثر خواتین گھروں اور مجلسوں میں ہر جمعرات بعد نماز مغرب پڑھتی ہیں۔ بے نظیر مثنوی (جو گویا اردو زبان میں مثنوی مولانا روم کا نعم البدل ہے) بائیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ صحیح بخاری شریف کی شرح "فیض الباری" (۱۲۹۲ھ) کے نام سے لکھی جو دس جلدوں میں ہے۔ یہ کتاب بخاری شریف کی سب سے پہلی اردو شرح ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا احقر کی درج ذیل کتابیں اہمیت رکھتی ہیں:

۱-خطبات حرمین (۲۸): جمعہ کے خطبات کا پہلا مجموعہ ہے جو اردو میں شائع ہوا۔

۲-تفسیر الجواہر: مولانا کی منظوم تفسیر ہے۔

۳-حدیقۃ الاحباب: خلفائے راشدینؓ کے حالات پر ایک ضخیم اور مبسوط نثری کتاب ہے۔

۴-شرح سر الشہادتین: حضرت امام حسینؓ کی سیرت پر ایک طویل نظم ہے۔

مطبوعہ ۱۳۰۲ھ۔

۵-خلاصۃ السیر : اسلامی تاریخ کا خلاصہ ہے۔

۶-روضۃ الابرار: اہل بیت کی سیرت وتاریخ پر مشتمل ہے۔

۷-تحفۂ مرغوب: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تعلق سے بڑی معلومات افزا کتاب۔

۸-تذکرۃ المجتہدین: ائمہ مفقہ کے حالات پر مبنی کتاب۔

۹-ریاض الازہر: سیرت طیبہ ﷺ پر یہ دوسرا ضخیم مجموعہ ہے۔جس میں سات ہزار سے زیادہ ابیات موجود ہیں۔

۱۰-نصرۃ التوحید: وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر تفصیلی بحث اس کتاب میں شامل ہے۔مطبوعہ ۱۳۲۵ھ۔

۱۱-حقوق الزوجین: معاشرے کے حالات پر یہ ایک وقیع اور جاندار نثری کتاب ہے۔

۱۲-منہج النبوت: اہمیت نبوت اور اسرار نبوت پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳-فوائد قدسیہ: یہ کتاب سید الاولیاء کی منقبت اور سوانح پر مشتمل ہے۔

۱۴-مطلع الانوار: مطبوعہ ۱۲۹۰ھ اور ۱۵-کلید معرفت: مطبوعہ ۱۳۰۰ھ۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ حضرت احقر بنگلوری نے اپنے دور میں بدعت اور خرافات کے رد میں کئی کتابیں تصنیف کیں جس سے اردو زبان وادب کا دائرہ وسیع ہوا۔مسلم قوم وملت کی خاطر خواہ اصلاح بھی ہوئی۔کرناٹک سے ہٹ کر بہت پہلے یہی مبارک کام اپنی شعری کاوشوں کے ذریعہ آندھرا پردیش میں حضرت مولانا سید شاہ رحمت اللہ (۲۸) نائب رسول (آستانہ مبارک رحمت آباد) اور شہر مدراس میں حضرت مولانا باقر آگاہ ویلوری (۲۹) اور قاضی بدر الدولہ (۳۰) نے انجام دیا تھا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ مولانا ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب کے قول کے مطابق آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔راقم الحروف کا خیال ہے کہ اردو ادب اور اسلامیات کی تاریخ میں آج تک کسی شاعر،ادیب،نقاد،عالم،مفسر کی اتنی کتابیں منظر عام پر جلوہ افروز نہیں ہوئی ہوں گی جو معیار کے اعتبار سے بھی اعلیٰ وارفع اور مواد کے اعتبار سے بھی ہر

دور کے انسان کے لیے سودمند ثابت ہوں۔ سرزمین کرناٹک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ حضرت مولانا عبدالحیٰ احقر بنگلوری کو اس نے جنم دے کر اپنی مٹی کو پاک، معطر اور معتبر بنالیا جس کی خوشبو ہمیشہ کے لیے ہے۔

حضرت مولانا احقر بنگلوری بنیادی طور پر ایک اسلامی شاعر تھے۔ ان کو پڑھتے وقت علامہ اقبال کی یاد آتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی طرح آپ کی شاعری اصلاحی اور بامقصد تھی، اقبال کی طرح ان کا بھی طبعی میلان نظم کی طرف زیادہ تھا۔ اقبال کی نظموں کی طرح مولانا احقر کی نظموں میں بھی سلاست، روانی اور فلسفہ وحکمت کی وہ تمام تر جلوہ سامانیاں موجود ہیں، جو اقبال کی شاعری کا اصل سرمایہ ہیں۔ مولانائے موصوف کی بلند خیالی، احساس وجذبے کی آئینہ گری اور فکر وفن کی مہارت نے اردو شعر کی ترقی میں قابل قدر اضافہ کیا۔

من حیث المجموع مولانا احقر بنگلوری کی بدولت جہاں علمی، دینی اور اصلاحی تحریروں کی کرنوں نے معاشرہ کو روشنی بخشی، وہاں دکنی اردو کو بھی خاطر خواہ تقویت اور فروغ نصیب ہوا۔ مولانا کی ان احسن خدمات کو اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

۳ رجب ۱۸۸۲ء کو مولانا کعبۃ اللہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے اور موصوف کے حب رسول ﷺ اور عشق نبوی ﷺ کی کامل قبولیت تھی کہ ان کا وقت آخر دیار محبوب کی پاک فضاؤں میں آیا اور مدینہ منورہ کی رشک افلاک زمین میں وہ آسودۂ خاک ہوئے۔

حوالے

(۱) مصنف مثنوی ''اسرار عشق''، (۱۶۸۲ء م ۱۰۹۳ھ) تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی۔ (۲) مصنف ''مصباح النور'' (نظم) ''شرح مصباح النور'' (نثر)۔ (۳) مصنف ''انتباہ الطالبین''۔ (۴) مصنف ''چہار کرسی طریقت''۔ (۵) مصنف بڑی چہار کرسی۔ (۶) مہتاب سخن (فارسی) شمع مجلس (اردو)۔ (۷) مصنف تحفۃ المجاہدین ۱۷۸۱ء۔ (۸) مولف مفرح القلوب، جس میں موسیقی کے قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف

مثنوی ''حقوق المسلمین'' ۱۲۲۴ء ٹیپو سلطان کے حکم پر رسالہ ''احکام النکاح'' بھی ترتیب دی۔(۹) مصنف ''نشان حیدری''۔(۱۰) ''مخزن العرفان'' ۱۹۱۳ء۔(۱۱) مصنف ''گنج شائگان'' ۱۸۰۶ء۔(۱۲) مصنف ''ریاض العارفین'' ۱۲۷۶ھ۔(۱۳) مصنف ''چھوٹی چارکرسی''۔ یہ مثنوی شگفتہ بحر، صاف اور سادہ دکنی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔آج بھی اکثر گھروں میں ہر جمعرات کو بعد نماز مغرب عورتیں بصد احترام ترنم سے پڑھتی ہیں۔(۱۴) مصنف ''مصباح الحیات'' ۱۸۷۰ء، ''خمسہ حیات'' ۱۸۶۱ء، ''شمع محفل''، ''تعلیم نسواں''۔ (۱۵) دیوان لطیف۔(۱۶) مصنف ''مثنوی غم''، مطبوعہ ۱۸۵۳ء، مدیر ''قاسم الاخبار'' ۱۸۶۱ء، یہ میسور کا پہلا اردو اخبار تھا جس کے تیس سے زیادہ شمارے منظر عام پر آئے۔(۱۷) ''دیوان نسیم'' غزلوں کا مجموعہ ہے لیکن مثنوی اور نثری تحریریں جس سے نسیم کی شخصیت اور فن کے نمایاں خد و خال اجاگر ہوتے ہیں آج تک کتابی صورت نہ دیکھ سکے۔اگر نسیم کی معرکۃ الآراء تحریریں منظر عام پر آجائیں تو نسیم کے مقام کے تعین میں بہت آسانی ہوگی۔(۱۸) مدیر ''شمع سخن'' ۱۸۸۴ء۔(۱۹) مدیر ''ترغیب'' ۱۸۸۹ء ''رسالہ نسواں''۔(۲۰) مولانا شہابؔ ویلور میں پیدا ہوئے۔مولوی غلام قادر مدراسی کی خانقاہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔مولانا قطب ویلور سے بیعت وخلافت کی منور منزلیں طے کیں۔قطب ویلور کی مشہور کتاب ''جواہر الحقائق'' پر آپ نے مقدمہ لکھا ہے۔آپ کے مریدین کی خاصی تعداد جنوبی ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔(۲۱) مصنف ''کلام جادو'' ۱۷۳۵ء۔ (۲۲) مصنف ''فوائد الاسلام''، ''شہادت نامہ''، ''رسول مقبول'' اور ''میزان المنطق''۔(۲۳) ''جنان السیر'' پر موصوف کا مقدمہ موجود ہے جس سے اطہرؔ کی بہترین نثری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔(۲۴) اپنے وقت کے جید عالم وفاضل تھے۔(۲۵) مستان قطب ویلور کے غائبانہ مرید تھے اور اپنی تالیف ''گلشن رحمانی'' ۱۸۹۲ء میں موصوف نے اپنے پیر و مرشد سید شاہ عبداللطیف قادری قطبؔ ویلور کا ذکر نہایت احترام وخلوص کے ساتھ کیا ہے۔(۲۶) پیاری بیگم پیٹ اب پرنام بٹ کے نام سے منسوب ہے۔(۲۷) حضرت عبدالحیٰ کا نام ماں باپ نے ''بڈھن بیگ'' رکھا تھا مگر قطب ویلور نے ان کا نام عبدالحیٰ تجویز کیا۔(۲۸) مولانا احقر بنگلوری اپنے خطبات کی مقبولیت کی بدولت حضرت واعظ بنگلوری کے نام سے بھی بہت مشہور ہوئے۔مطبوعہ خطبات کی اولیت کا سہرا بھی موصوف کے سر ہے۔

صحابیتِ مروان

(استدراک)

جناب واصل واسطی

ماہنامہ ''معارف'' (فروری ۲۰۱۰ء) میں مولوی کلیم صفات اصلاحی صاحب کا مضمون ''ضیاء الدین اصلاحی بحیثیت تبصرہ نگار'' نظر سے گزرا۔ بحیثیت مجموعی مضمون معلومات افزا تھا۔ بہت سارے کام کے نکتے اس میں آگئے ہیں۔ مگر ایک جگہ بہت ہی نادر بات کہی گئی کہ حضرت مروان صحابیت کے درجے پر فائز ہیں۔ پہلے مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی یہ عبارت ملاحظہ ہو ''مصنف نے بعض کبار صحابہؓ کے ناموں کی فہرست میں مروان کا نام بھی لکھا ہے۔ مترجم نے بشمول مروان ان سب کو جلیل القدر صحابہؓ بتایا ہے۔ جلیل القدر ہونا تو درکنار مروان کا صحابی ہونا بھی مسلم نہیں (معارف ۱۳۶) اس عبارت پر کلیم صفات اصلاحی نے لکھا'' یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ مروان کے صحابی ہونے کے متعلق مولانا (ضیاء الدین) اصلاحی کا موقف درست نہیں ہے۔ ابن حجر عسقلانیؒ نے مقدمہ فتح الباری میں جہاں رواۃ بخاری کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مروان بن الحکم کا نام بھی شامل کیا ہے اور ان کے متعلق عروہ بن زبیرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کے سلسلے میں مروان کو متہم نہیں کیا جا سکتا۔ سہیل بن سعد صحابی کا بھی ان کے متعلق یہی قول ہے اور وہ بھی ان کے صدوق ہونے کی گواہی دیتے تھے۔

ابن کثیرؒ نے مروان کو صحابی لکھا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق مروان رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں پیدا ہوئے۔ اور صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں ان کی حدیث بھی مروی ہے اور بخاری میں بھی ان سے ایک روایت مروی ہے۔

جمہور محققین میں اکثر نے مروان کو صحابی تسلیم کیا ہے۔ دور جدید کے مشہور محقق پروفیسر یاسین مظہر صدیقی صاحب کی بھی تحقیق یہی ہے۔ ان کی صحابیت اب غیر متحقق اور مشکوک نہیں رہی۔

رکن ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔

البتہ حضرت طلحہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے خون سے ان کا دامن داغ دار ہے۔ اس لیے ان کی عظمت و بلند پایئگی کو وہ مقام نہیں دیا جاسکتا جس پر دوسرے اجلہ صحابہؓ فائز ہیں'۔ (ایضاً ۱۳۶)

اس تحقیق کا اگر خلاصہ کیا جائے تو درج ذیل نقشہ سامنے آتا ہے:

۱- حافظ ابن حجرؒ کے مقدمہ فتح سے ان کی ثقاہت وصحابیت کا اشارہ ملتا ہے۔۲- عروہ بن زبیرؓ نے ان کی توثیق کی ہے۔۳- سہیل بن سعد نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔۴- ابن کثیرؒ نے اس کو صحابی تسلیم کیا ہے۔۵- حضرت یاسین مظہر ان کو صحابی تسلیم کرتے ہیں۔۶- جمہور محققین بھی ان کی صحابیت کے قائل ہیں۔۷- وہ صحابی تو ہیں مگر اجلہ صحابہؓ سے کم تر درجہ پر فائز ہیں۔

اب ترتیب وار ہم اس پر کچھ گزارشات پیش کرتے ہیں:

یہ بات تو بالکل درست ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ فتح الباری میں ان کو ان رواۃ میں شامل کیا ہے جن پر لوگوں نے جرح کی ہے اور حافظؒ نے ان کا دفاع کیا ہے۔ بلکہ ان کو ثقہ راوی قرار دیا ہے۔ مگر کلیم صفات اصلاحی کا مدعا تو ان کو صحابی ثابت کرنا تھا۔ ثقہ ہونے سے صحابیت تو لازم نہیں آتی۔ ورنہ عمران بن حطّان، یونس بن حبان وغیرہ کو بھی صحابی کہنا پڑے گا۔ البتہ اگر حافظؒ نے وہاں مروان کے صحابی ہونے کی تصریح کی ہو۔ تب تو کلیم صفات اصلاحی کی بات درست ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حافظ کا یہ دفاع ثقاہت مروان خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مروان کو صحابی نہیں سمجھتے۔ ورنہ تو جارحین کے جواب میں صرف یہ لکھنا کافی تھا کہ وہ صحابی ہیں۔ اور ''الصحابة كلهم عدول'' مگر جب اس کو پیش نہ کیا۔ تو خود بخود سمجھا جاسکتا ہے کہ معاملہ کی صورت کچھ اور ہے۔ حافظ نے ان کے دفاع میں دو باتیں لکھی ہیں۔ [۱]''مروان کی روایت حدیث اعمال موبقہ کے ارتکاب سے پہلے ہے۔ لہذا یہ اعمال ان کی روایت پر اثر انداز نہیں ہوسکتے'' اور ''عروہ بن زبیر وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ لہذا ان کی روایت بلا شبہ درست ہے اور امام بخاریؒ پر اس حوالے سے کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا ہے'' مگر حافظ کے ان دونوں جوابات کو محققین نے تسلیم نہیں کیا۔ پہلے دفاع کے جواب میں حضرت یوسف کاندھلویؒ نے لکھا:

وهذا الجواب مبنى على الجهل یہ جواب تاریخ سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ

---

[۱] یہی بات ابن حزم نے بھی محلیٰ میں لکھی ہے۔

بالتاریخ فقد صنع مروان ما صنع فی خلافة عثمان حتی ادی صنیعه الی قتل عثمان ثم انه رمی طلحه احد العشره یوم الجمل وهما جمیعا مع عائشه فقتل وقد عد ذلك من موبقاته وکل ذلك قبل خروجه علی ابن الزبیر بل قبل امارته علی المدینة الطیبة الطاهره علی صاحبها الف الف صلوٰة وتحیة والعجب عن الحافظ کیف رضی عن هذا الجواب فذکره فی التلخیص ولم یذکر مافیه۔	مروان نے تو بہت کچھ خلافت عثمان کے دوران کیا۔ یہاں تک کہ خلیفہ کی شہادت پر ان کی کارروائیاں منتج ہوئیں۔ پھر اس نے طلحہ کو جو عشرۂ مبشرہ میں سے تھے تیر مارا۔ وہ اور زبیر دونوں ام المومنین عائشہؓ کے ساتھ تھے۔ جس سے وہ شہید ہوگئے اور یہ مروان کے مہلک افعال میں سے شمار کیے گئے۔ ان کے یہ سارے کام ابن زبیر پر خروج کرنے سے پہلے کے ہیں۔ بلکہ مدینہ منورہ پر ان کی امارت سے بھی پہلے کے ہیں۔ تعجب ہے حافظ ابن حجر پر وہ اس جواب سے کیسے مطمئن ہوئے کہ اس کو تلخیص میں ذکر کیا۔ مگر اس کی خامیوں کو بیان نہیں کیا۔

(امانی الاحبار، ص ۳۳۹/۱)

یہ تو پہلی دفاعی توجیہ کا جواب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جواب کا کوئی جواب نہیں ہے۔

اب رہ گئی دوسری توجیہ تو اس میں حافظ صاحب کو بہر حال غلطی ہوئی ہے۔ اصل عبارت کچھ اور ہے۔ ''مقدمہ'' میں کچھ اور بن گئی، تاریخ کبیر میں امام بخاریؒ نے مروان کے بارے میں لکھا کہ اہل مدینہ میں سے ہے۔ عثمان بن عفان اور بسرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں پھر لکھا مجھ سے محمد نے بیان کیا اس نے محمد سے اس نے محمد بن سعید سے اس نے علی بن مسہر سے اس نے ہشام بن عروہ سے اس نے اپنے والد سے روایت کی کہ مجھے مروان نے خبر دی۔ پھر فرمایا کہ میرا گمان نہیں کہ وہ ہم پر کوئی تہمت باندھ لے گا''۔ اب اصل عبارت ملاحظہ ہو:

''یعد فی اهل المدینة سمع عثمان بن عفان وبسره روی عنه، عروة ابن الزبیر نا محمد قال نا محدنا محمد بن سعید قال نا علی بن مسهر بن هشام بن عروه عن ابیه قال اخبرنی مروان بن الحکم قال فلا اخاله یتهم علینا''۔ (التاریخ الکبیر، ص ۲۴۵/۷)

اس عبارت سے حدیث میں متہم نہ ہونے کی بات کہاں ثابت ہوتی ہے؟ یہاں پر تو یہ لکھا ہے کہ ہم پر تہمت نہیں باندھے گا۔ حافظ کی اس نقل نے بہت سے لوگوں کو تعجب میں ڈال دیا۔ مثال کے طور پر احمد رضا بجنوری جنہوں نے انوار الباری کے حاشیہ میں لکھا ''مقدمہ فتح الباری میں مروان سے روایت بخاری کی مدافعت میں حافظ نے عروہ بن زبیر کا قول نقل کیا کہ وہ حدیث کے بارے میں متہم نہ تھا''۔ اور یہی بات تہذیب واصابہ میں بھی نقل کی لیکن (تاریخ کبیر بخاری، ج ۴، ص ۳۶۸) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ (باوجود خاندانی عداوت کے) میرا گمان ہے کہ مروان ہم لوگوں پر کوئی اتہام نہ لگائے گا۔ اس میں اس کی حدیث کے بارے میں کوئی توثیق نہیں ہے۔ اس پر تاریخ کبیر کے محشی علام نے بجا لکھا کہ ''دونوں جملوں میں بہت بڑا فرق ہے''۔ اور مسند احمد میں بھی اسی طرح ہے اور حافظ نے کیا بات تھی اور کیا نقل کر دی؟ (انوار الباری، ج ۶، ص ۴۴۶) یعنی حافظ ابن حجر کے اس نقل کے اعتماد پر عروہ کا مروان کو موثوق فی الروایت قرار دینا درست نہیں ہے۔ یہاں ضمناً ایک بات اور بھی ذہن میں رہے تو اچھا ہے کہ امام بخاری نے مروان کو صرف اہل مدینہ میں سے قرار دیا۔ صحابہ کی صف میں اس کو لا کر نہیں کھڑا کیا اور یہ بھی نہیں لکھا کہ انہوں نے نبی علیہ السلام سے روایت کی ہے آگے امام بخاری کی تصریح آجائے گی کہ مروان نے نبی علیہ السلام کو دیکھا بھی نہیں۔

اب ذرا محدثین کے کچھ اقوال ان کے بارے میں دیکھتے ہیں۔ تاکہ حضرت مروان کی صحابیت کا اندازہ ہو جائے۔ ابن سعد نے ان کو تابعین کے طبقہ اولیٰ میں شمار کیا اور پھر لکھا ''قالوا قبض رسول اللہ ﷺ و مروان بن الحکم ابن ثمانی سنین فلم یزل مع ابیه فی المدینه حتی مات ابوه الحکم ابن ابی العاص فی خلافة عثما ن بن عفان''۔ (الطبقات لابن سعد، ۱۹/۵) علماء کہتے ہیں کہ مروان بن الحکم نبی علیہ السلام کے وفات کے وقت ۸ سال کے تھے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مدینہ ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ ان کے والد حکم بن العاص حضرت عثمان کے دور خلافت میں وفات پا گئے۔ ابن سعد کی تحقیق کے مطابق وہ مدینہ ہی میں رہے۔ مگر یہ بات خالی از علت نہیں ہے۔ سردست ہم اس موضوع سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے ان کے بارے میں لکھا ''روی عن عمر و

عثمان و علی'' (الجرح والتعدیل ، ۳۰۹/۸) مروان نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے روایت کی ہے۔ البتہ ابن ابی حاتم نے ان کی صحابیت کی تصریح نہیں کی اور نہ یہ کہا ہے کہ اس نے نبی علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ اس کے حافظ مغرب ابن عبدالبر کی تحقیق پر نظر ڈالی جائے۔ فرماتے ہیں۔ مروان ۲ رہجری میں پیدا ہوئے اور بعض کی رائے کے مطابق خندق کے سال پیدا ہوئے۔ بعض نے کہا ہے کہ مکہ میں پیدا ہوئے اور کچھ لوگ طائف کہتے ہیں۔ امام مالکؒ کے قول کے مطابق نبی علیہ السلام کی وفات کے وقت وہ آٹھ سال کا تھا یا اس کے قریب۔ نبی علیہ السلام کا دیکھنا ان کو نصیب نہ ہوا تھا۔ اس لیے کہ وہ بچپن میں والد کے ساتھ طائف کو نکلے تھے۔ اصل عبارت یہ ہے'' ولد علی عہد رسول اللہ ﷺ سنة اثنتین من الهجر ة وقیل عام الخندق وقال مالك ولد مروان بن الحکم یوم احد و قال غیره ولد مروان بمکة ویقال ولد بالطائف فعلی قول مالك توفی رسول اللّٰه ﷺ وهو ابن ثمان سنین او نحوها ولم یره لانه خرج الی الطائف طفلا لا یعقل ذلك''۔ (الاستیعاب، ۴۲۵/۳) اور ابن الاثیرؒ نے بھی اس کے قریب قریب لکھا'' ولد علی عهد رسول اللّٰه ﷺ قیل ولد سنة اثنتین من الهجرة وقال مالك ولد یوم احد وقیل یوم الخندق وقیل ولد بمکة وقیل بالطائف ولم یر النبی ﷺ لانه خرج الی الطائف طفلا لا یعقل''۔ (اسد الغابة، ۴۴۸/۴)

صاحب رجال الکتب التسعة نے بھی لکھا:

اخرج له البخاری وابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجه لا یثبت له صحبة۔ (۵۳۰/۳)	مروان کتب خمسہ کے راوی ہے (بجز مسلم) ان کی صحابیت ثابت نہیں ہے۔

ابوالحجاج مزیؒ رقم طراز ہیں'' روی عن النبی علیه السلام حدیث الحدیبیة بطوله'' مگر اس کے بعد ہی یہ بھی لکھ دیا: ولد بعد الهجرة بسنتین وقیل باربع وکان اصغر من عبد اللّٰه بن الزبیر باربعة اشهر ولم یصح له سماع من النبی ﷺ۔

(تهذیب الکمال ،۵۶۲/۶)یعنی نبی علیہ السلام سے حدیث حدیبیہ جو کہ طویل روایت ہے۔ روایت کی ہے۔ پھر فرماتے ہیں ''وہ دوسری ہجری میں پیدا ہوئے۔ بعض کے مطابق ۴رہجری میں، وہ عبداللہ بن زبیر سے چار مہینے چھوٹے تھے۔ نبی علیہ السلام سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔ اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ پہلے ان کا یہ لکھنا کہ نبی علیہ السلام سے روایت کی ہے پھر یہ لکھنا کہ اس کا سماع ان سے ثابت نہیں ہے۔ کیا مطلب رکھتا ہے۔ یہ بات حافظ ابن حجر کی روایت سے انشاءاللہ اور بھی واضح ہو جائے گی۔

امام شمس الدین ذہبیؒ بھی لکھتے ہیں:

مروان بن الحكم الاموی ابو عبد الملك قال البخاری لم یر النبی علیه السلام ، قلت روی عن بسره وعن عثمان وله اعمال موبقة نسأل الله السلامة رمی طلحة بسهم وفعل و فعل ۔	امام بخاری فرماتے ہیں کہ مروان اموی نے نبی ﷺ کو نہیں دیکھا میں (ذہبی) کہتا ہوں۔ اس نے بسرہ اور عثمان سے روایت کی ہے۔ وہ مہلک اعمال کا مرتکب ہوا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ اس نے طلحہ کو تیر مارا تھا اور بھی ایسے کام کیے۔

(میزان الاعتدال،۸۲/۴)

اب آخر میں حافظ ابن حجر کے اقوال کو بھی ملاحظہ کرتے ہیں تا کہ یہ مسئلہ پوری طرح مبرہن ہو جائے اور شک وتردد کی گنجائش نہ رہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

ولد بعد الهجرة بسنتين وقيل باربع وروی عن النبی ﷺ ولا یصح له منه سماع ۔	مروان دو ہجری میں پیدا ہوا۔ بعض کے نزدیک چار میں اور نبی ﷺ سے روایت کی ہے۔ مگر اس کا آنحضور ﷺ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

(تهذیب التهذیب،۹۱/۱۰)

اس عبارت سے ''تہذیب'' کے نفی صحابیت (سماعت؟) اور روایت عن النبی علیہ السلام والی بات کی اور بھی وضاحت ہوگئی اور تقریب میں بھی فرماتے ہیں'' لا یثبت لی صحبة من الثانية ''(تهذیب التهذیب،۳۳۲/۲)یعنی طبقہ ثانیہ میں سے ہے البتہ شرف

صحبت سے محروم ہے۔ اسی طرح بدرالدین عینیؒ بھی لکھتے ہیں "ولد بعد الهجرة بسنتين وقيل باربع ولم يصح له سماع من النبى عليه السلام"۔ (نخب الانکار، ۱/۴۲۲) اکثر محدثین نے مروان کی صحابیت سے انکار کیا ہے۔ حافظ کی تصریح تو گزر گئی۔ البتہ مقدمہ کی بات چونکہ کلیم صفات اصلاحی نے کی ہے تو اس پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ وہاں حافظ نے کوئی یقینی بات نہیں کی ہے۔ فرماتے ہیں:

يقال له روية فان ثبت فلا يعرج على من تكلم فيه وقد قال عروه بن الزبير كان مروان لا يتهم فى الحديث وقد روى عنه سهل بن سعد الساعدى الصحابى اعتمادا على صدقه۔ (هدى السارى الفصل التاسع)	کہا جاتا ہے کہ مروان نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو پھر جو شخص اس میں طعن کرتا ہے۔ اس کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی۔ اور عروہ بن زبیر نے فرمایا کہ مروان متہم فی روایت الحدیث نہ تھا۔ اور سہل بن سعد صحابی نے ان کے صدق پر اعتماد کرتے ہوئے ان سے روایت کی ہے۔

"ان ثبت" کے لفظ نے حافظ کے تردد کو واضح کیا ہے اور پھر سہل کے بارے میں "اعتمادا على صدقه" نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وہ اس لیے کہ اگر حافظ مروان کو صحابی تسلیم کرتے تو پھر "اعتمادا على صدقه" کی کیا ضرورت ہے؟ کیا صحابہ کرام میں بھی صادق و غیر صادق ہوئے ہیں؟ حافظ کی اس عبارت نے کلیم صفات اصلاحی کے اس قول کا بھی فیصلہ کر دیا "کہ سہل بن سعد صحابی کا بھی ان کے متعلق یہی قول ہے"۔ (معارف، ص ۱۳۶) اس لیے کہ کسی سے روایت کرنا الگ مسئلہ ہے اور یہ کہنا کہ وہ ثقہ ہے بالکل دوسرا مسئلہ ہے اور تمام محدثین مروان کو کیونکر صحابی تسلیم کرتے۔ جب کہ خود ان کی عبارتوں سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ صحابی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مروان نے ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں کہا "وہ مجھ سے کسی طرح معتبر نہیں البتہ مجھ سے کچھ عمر میں بڑے ہیں اور شرف صحابیت بھی ان کو حاصل ہے"۔ ليس ابن عمر باخبر منى لكنه اسن منى وكانت له صحبة۔ (تہذیب التہذیب، ۱۰/۹۲) مروان کا یہ قول اس کے نفی صحابیت میں نص صریح کا سا درجہ رکھتا ہے۔

یہ تو ہوئے اصل مسئلہ کے متعلق چند گزارشات۔

اور یہ بات تو بہرحال ثابت ہے کہ امام مسلمؒ نے مروان سے روایت نہیں لی ہے۔ کیا یہ متصور ہے کہ امام مسلم ان کو صحابی مانتے اور پھر ان سے روایت نہ کرتے؟ اسی طرح بدر عینی ابن حبان سے نقل کرتے ہیں "قال ابن حبان معاذ الله ان يحتج به"۔ (مغانی الاخیار، ۵۵۴/۳) اسی طرح حافظ نے بھی لکھا "اخرجه، ابن حبان من طريق عبد الله بن ابی بكروقال لم احتج بمروان"۔ (الدرایۃ، ۳۸/۱) کیا یہ ممکن ہے کہ ابن حبان ان کو صحابی مان کر پھر ان کی شان میں اتنے سخت الفاظ استعمال کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ علماء و محدثین اس "تحقیق" سے بالکل بری ہیں۔ جو ان کے نام سے پیش کی جارہی ہے۔

البتہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں ان کو صحابی لکھا ہے۔ "مروان بن الحكم ...... صحابی عند طائفة كثيرة لانه ولد فی حياة النبی صلی اللہ علیہ وسلم وروىٰ عنه فی حدیث صلح الحديبية"۔ (البدایہ، ۱۷۱۳/۱) مروان ایک بڑی جماعت کے صحابی ہیں۔ اس لیے کہ وہ نبی علیہ السلام کی زندگی میں پیدا ہوئے۔ اور ان سے صلح حدیبیہ کی حدیث روایت کی ہے۔ مگر مجھے یہ لگتا ہے کہ انہوں نے دوسروں کی رائے بیان کی ہے۔ ان کی اپنی رائے نہیں ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں "و مروان كان اكبر الاسباب فی حصار عثمان لانه زور علی لسانه كتابًا الی مصر بقتل اولائك الوفد ولما كان متوليًا علی المدينة لمعاوية كان يسب عليًا كل جمعة علی المنبر"۔ (البدایۃ والنہایۃ، ۱/ ۱۷۱۴) حضرت عثمانؓ کے محصور ہونے کا سب سے بڑا سبب مروان تھا۔ اس لیے کہ اس نے حضرت عثمانؓ کے نام سے ایک خط مصر کو روانہ کیا تھا کہ اس وفد کو قتل کرے اور پھر جب مدینہ کا گورنر بنا تو ہر جمعہ منبر پر حضرت علیؓ کی شان میں برا بھلا کہتا۔ اس کے علاوہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ "مروان" کے بارے میں اہل سنت کے ہاں جو غلیظ قسم کی عبارتیں ملتی ہیں۔ وہ سب کے سب بانگ دہل کہہ رہی ہیں کہ ان کے لکھنے والے مروان کو صحابی تسلیم نہیں کرتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی وہ بات صحیح ہے "کہ جلیل القدر ہونا تو درکنار مروان کا صحابی ہونا بھی مسلم نہیں"۔

اخبار علمیہ

سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے اپنے شاہی حکم نامہ میں کہا ہے کہ اجرائے فتوی کا حق صرف حکومت کے اجازت یافتہ مفتیان کرام کو ہوگا ، انہوں نے گذشتہ چند مہینوں میں بعض سعودی علماء کے ان فتووں کا حوالہ دیا جو مذہب اسلام کی تعلیمات کے بالکل منافی تھے، انہوں نے غیر اہم اور غیر ضروری موضوعات پر دیے جانے والے فتووں پر مکمل امتناع عاید کیا ہے، حکم نامہ میں کہا گیا ہے کہ ہماری مذہبی اور قومی ذمہ داری ہے کہ صرف انہیں فتووں پر عمل آوری کو یقینی بنایا جائے جو اکابر علماء کی جمعیت کی جانب سے جاری کیے جاتے ہیں ، علماء کے مابین اختلاف مسائل صرف ان ہی تک محدود رکھا جائے ، سرکردہ علماء نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا ہے۔

یونیسیف نے افغانستان کی جیلوں میں اسیر بچوں سے گفتگو پر مبنی ایک رپورٹ شائع کی ہے۔اس کے مطابق وہاں بڑی تعداد میں قیدی بچوں کو بدترین تشدد اور جنسی زیادتی کا سامنا ہے، جیلوں کا نظام انتہائی خراب اور ناگفتہ بہ ہے، رپورٹ کے مطابق امریکی خبر رساں ادارے آئی پی ایس کو افغانستان کے ۲۸ ر صوبوں کی مختلف جیلوں کا دورہ کرنے کی اجازت دی گئی تو معلوم ہوا کہ ان بچوں کو معمولی جرم کی پاداش میں قید کیا گیا ہے اور سخت اذیتیں پہنچائی گئیں، جب وفد نے بچوں سے بات کی تو ان کا جواب بڑا ہی مضحکہ خیز تھا کہ یہ بچے جرح کے دوران چپ رہتے ہیں، لہذا ان کی خاموشی اعتراف جرم قرار پاتی ہے، قریب ۶۰۰ ر سے زاید بچوں میں ۸۰ ر بچیاں بھی ہیں۔

سعودی عرب کی ایک اقتصادی تنظیم ''المساح کیپٹیل'' نے اپنی ایک رپورٹ ''سعودی خواتین تبدیلی کی علامت ہیں'' کے عنوان سے پیش کی ہے کہ سعودی عرب کی دولت کا ایک بڑا حصہ وہاں کی عورتوں کے پاس ہے، وہاں کی آبادی میں ۴۵٪ خواتین ہیں اور ان کی شرح خواندگی ۷۹٪ ہے لیکن صرف ۱۵ فیصد خواتین ہی روزگار سے وابستہ ہیں، بے روزگار خواتین میں ۷۸،۳٪ یونیورسٹی

کی فارغ التحصیل ہیں۔ المساح کیپٹل کا دعوی ہے کہ سعودی عرب کے پاس بے روزگار تعلیم یافتہ اور باصلاحیت خواتین کی شکل میں جو بہترین انسانی اور مالی سرمایہ موجود و محفوظ ہے اگر اس کو موثر طریقہ سے بروئے کار لایا جائے تو وہاں کے اقتصادی حالات بہتر سے بہترین ہو سکتے ہیں۔

مغربی بنگال کا سب سے قدیم روزنامہ ''آزاد ہند'' کولکاتا جس کا اجراء مشہور صحافی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا تھا اور جس کی ادارت ان کے لائق صاحب زادے جناب احمد سعید ملیح آبادی نے بڑی شان سے کی، خبر آئی کہ اب یہ اخبار اپنی اشاعت بند کر رہا ہے، اس اخبار نے اردو صحافت کے معیار اور اس کے قد کو بلندی بخشی تھی، اس کے اداریے، اس کے ادبی کالم اور خاص طور سے اس کے مزاحیہ کالم کو بڑا اعتبار حاصل رہا، کلکتہ کی اردو دنیا کے ترجمان ہونے کے ساتھ اخبار اردو صحافت کی اعلیٰ روایات کا پاسبان اور امین بھی رہا، افسوس کہ مالی دشواریوں کی وجہ سے ایسے تاریخی اخبار کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا، خدا کرے اس کی حیات نو کا سامان ہو سکے۔

جرمنی کے میگڈیبرگ چرچ کے ایک شاہی مقبرے سے کچھ ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں جس کے متعلق ماہرین آثار قدیمہ کا دعوی ہے کہ یہ الفرایڈ اعظم کی پوتی ملکہ ایڈگتھ (Eadgyth) کی ہیں، برطانوی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے اس مقبرے کے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ برطانوی شاہی خاندان یہ سب سے پرانی ہڈی کی دریافت ہے، اس پروجیکٹ پر دو سال سے کام ہو رہا تھا۔

عصر حاضر میں ایٹمی ماہرین ایندھن کی تیاری کے لیے زمین میں موجود Uraninite سے یورینیم پیدا کرتے ہیں لیکن کیلیفورنیا کے محققین نے انکشاف کیا ہے کہ سمندری پانی میں موجود پانی میں کم از کم ۵،۴ ارب ٹن یورینیم شامل ہے جو زمین کے یورینیم ذخائر سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے۔

اکیسویں صدی کے پہلے بڑے شعری مجموعہ کی تقریب رونمائی ۱۱ رنومبر ۲۰۱۱ء کو امریکہ میں ہوگی، گیارہ ہزار ۱۱۱ رصفحات پر مشتمل یہ مجموعہ بیک وقت اردو، انگریزی اور روسی تینوں زبانوں میں ہے، اس کو یوسف قادری نے ترتیب دیا ہے، اس تقریب کا اہتمام اسپیس اردو اکیڈمی آف

امریکہ اور دی عثمانین یو ایس اے مشترکہ طور پر کریں گے، اس کی اطلاع ۲۱ رمئی ۲۰۱۰ء کو شاہی بنکویٹ ہال، ایسٹ نارتھ ایلی نالے لمبارڈ میں منعقد ہونے والے استقبالیہ جلسے سے ملی۔

فلسطین سنٹر فار ریسرچ اینڈ کلچرل ڈائیلاگ کی ایک جائزہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مولد بیت اللحم میں آباد نوے فیصد عیسائیوں کے مسلمانوں سے دوستانہ اور عزیزانہ روابط ہیں، ۷۰٪ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ فلسطینی انتظامیہ مسیحی ورثہ کا احترام کرتی ہے، انہیں مذہبی رواداری اور قومی یک جہتی کی دیرینہ روایات پر یقین ہے، خیر سگالی کے جذبات اور ایک دوسرے کے مذہبی رسوم و روایات کے احترام کے جذبہ سے سرشار وہاں کے عیسائی اپنے مسلمان دوستوں کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھ رہے ہیں۔

ہفت روزہ ''ملی گزٹ'' میں شائع خبر کے مطابق پنجاب کے سمرالہ قصبے سے دس کلومیٹر دور ایک گاؤں سرور پور میں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی تھی، تقسیم وطن کے بعد اگست ۱۹۴۷ء میں برپا فسادات سے متاثر ہوکر گاؤں کے بیشتر مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے، برادران وطن اور سکھوں نے مشتعل ہوکر گاؤں کی مسجد منہدم کر دی لیکن گذشتہ سال گاؤں کے سکھوں نے مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا اور ۲۲ رمئی کو کرپال سنگھ، ممبر اسمبلی گل جیون سنگھ، پنجاب وقف بورڈ کے چیر مین محمد عثمان اور تمام گاؤں والوں کی موجودگی میں مسجد کی چابی مولانا حبیب الرحمان ثانی لدھیانوی صاحب کے حوالہ کر دیں۔ اس موقع پر اللہ اکبر کے نعرے بھی لگائے گئے۔ مذہبی منافرت اور تعصب کے موجودہ ماحول میں یہ قابل قدر مثال ہے۔

لاس اینجلس کی یونیورسٹی آف ٹولین اور یونیورسٹی آف اریزونا کے محققین کی مشترکہ تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ بندروں میں پایا جانے والا ایچ آئی وی وائرس ہزاروں برس قدیم ہے، کیمرون کے ساحل پر بندروں پر کی گئی اس تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ اس وائرس کو بحر اوقیانوس سے بحر ہند اور افریقہ کے بالائی حصہ تک پہنچنے میں ہزاروں برس لگ گئے، ان کا کہنا ہے کہ ایچ آئی وی وائرس سے بھی پہلے کی قسم ایس آئی وی Simian Immunodeficioncy Virus ۳۲ سے ۷۵ ہزار برس پرانی ہوسکتی ہے۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

شمس الرحمان فاروقی

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
پوسٹ بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن، بہار۔
۲۳/۸/۲۰۱۰ء

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف'' جولائی ۲۰۱۰ء کے شمارے میں معارف کی مجلس ادارت میں جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب کا اسم گرامی دیکھ کر مسرت ہوئی، فاروقی صاحب جیسے دانش ور کا معارف کی مجلس ادارت میں شامل کیا جانا جہاں معارف کے لیے باعث مسرت ہے وہیں فاروقی صاحب کے لیے کچھ کم اعزاز نہیں، خواجہ نظیری (وفات ۱۰۲۳ھ) کی ایک نعتیہ غزل کا یہ مطلع:

صفا از عقدۂ دلہاست آں زلف معقد را
بحمد اللہ کہ ربطی ہست با مطلق مقید را

میرے لیے بہت دنوں تک لاینحل رہا۔ اس شعر کی تشریح کے لیے ناچیز نے فارسی زبان وادب کے کئی ماہرین سے رجوع کیا۔ لیکن کسی نے اس شعر کی تشریح نہیں کی۔ تشریح کی تو دو فاروقیوں نے، ایک پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم (۱۹۳۴ء-۲۰۰۴ء) اور دوسرے شمس الرحمان فاروقی (ت ۱۹۳۵ء)، پروفیسر نثار احمد فاروقی نے درج بالا شعر کی یوں تشریح کی:

''(نظیری کے) شعر میں صفا سے مراد اخلاص ہے، زلف مُعَقَّد گھونگھریالے بال ہیں (رسول اللہ ﷺ کے بارے میں عام طور پر یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ کے بال گھونگھریالے تھے، اس لیے انہیں معقد کہا ہے۔ اور دل ان میں پھنسے ہوئے ہیں اس لیے بھی) مگر ان کی درازی سے زلف، مکدر نہیں

ہوتی، ان سے صفا و اخلاص کا تعلق رکھتی ہے۔ زلف کو مطلق یعنی آزاد کہا ہے۔
دل ان کی قید میں ہیں، اس لیے مقید ہیں۔ اس طرح ایک مطلق کو مقید سے ربط
اخلاص قائم ہے یہاں ذات باری کے مطلق ہونے کی طرف اشارہ نہیں''۔

جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب سے نظیری کے مذکورہ شعر کی تشریح کے لیے رجوع کیا تو انہوں نے اس کی گرہ کشائی یوں کی:

''آپ نے نظیری کا جو شعر نقل کیا ہے وہ نعت میں نہیں ہے بلکہ غزل کا مطلع ہے۔ اس کا سادہ ترجمہ یوں گا:

اس گرہ در گرہ زلف کی زینت ان دلوں کے سبب سے ہے جو اس میں الجھے ہوئے ہیں (یعنی قید میں ہیں) اللہ کا شکر ہے کہ دل جو مقید ہیں انہیں زلف سے ربط ہے جو مطلق ہے۔

مقید اور مطلق اصطلاحیں بھی ہیں۔ وہ کلمہ یا شے جو کسی شے کی پابند ہو مقید کہلائے گی اور جو شئے کسی شے کی پابند نہ ہو مطلق کہلائے گی۔ اس تشریح کی روشنی میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ زلف کے لیے لفظ مطلق اور زلف میں الجھے ہوئے دلوں کے لیے لفظ مقید کس قدر خوب صورت اور بامعنی ہے''۔

جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب نے نظیری کے زیر بحث شعر کا عام فہم ترجمہ اور بڑی دل نشین تشریح کی ہے۔ لیکن انہوں نے اس شعر کو مطلقاً غزل کا مطلع قرار دیا ہے۔ جب کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم کے نزدیک نظیری کا زیر بحث شعر، نعتیہ غزل کا مطلع ہے۔ مولانا ماہر القادری مرحوم (۱۳۲۴ھ-۱۳۹۸ھ) نے فاران (کراچی) کے سیرت نمبر میں نظیری کے مذکورہ بالا شعر اور اس کے بعد کے اشعار کو نظیری کے نعتیہ کلام میں شمار کیا ہے۔ یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

کہ دادی روح را با جسم الفت گر نہ گردیدی
محمد ﷺ کارواں سالار ارواحِ مجرد را

بہ مکتب خانہ سرِّ مصحف از بر داشت آں روزی
کہ عقل کل نمی کرد از الف بے، فرقِ ابجد را

وجودِ مرکزِ پرکارِ عالم کی شدی ثابت
احد خود قاب قوسین ار نہ بودی میم احمد را
بہ مسکن بستر از پہلوی گرمش سرد ناگشتہ
کند طی بر براق معرفت اقصای متصد را

(فاران، سیرت نمبر، ص ۱۲۴)

ان اشعار سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نظیری کا زیر بحث شعر اس کی نعتیہ غزل کا مطلع ہے۔
معارف کے توسط سے جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب کو ایک خوش خبری دینا چاہتا ہوں، فاروقی صاحب نے سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی پاکستان) کے شمس الرحمان فاروقی نمبر میں اپنے مضمون ''میرا ذہنی سفر'' میں اپنے نانا مرحوم کے والد عبدالقادر المتخلص قادر بنارسی کی تصنیف ''رہنمائے تاریخ اردو'' کا ایک نسخہ جو فاروقی صاحب کے طالب علمی کے زمانے میں مدت تک ان کے پاس رہا، مگر کھو گیا، اس پر انہوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اتفاق سے یہ کتاب ناچیز کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اگر فاروقی صاحب کو اس کتاب کی ضرورت ہو تو ناچیز اس کا عکس ان کو بھیج سکتا ہے۔

ایک اور بات کی طرف فاروقی صاحب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ فاروقی صاحب نے مذکورہ بالا مضمون میں اس شعر:

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں　　ایک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

کو دل لکھنوی کی طرف منسوب کیا ہے۔ جب کہ یہ شعر سیماب اکبرآبادی مرحوم (۱۸۸۰ء-۱۹۵۲ء) کا ہے۔ (روشنائی، ص ۲۷۵)

والسلام

(جناب) وارث ریاضی

قرآن مجید اور فلسفہ کائنات

محمد علی روڈ، ممبئی -۳۔
۲۳/اگست ۲۰۱۰ء

مکرمی جناب مرتب صاحب دام اقبالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خیریت مزاج عالی! عرض خدمت ہے کہ ماہنامہ "معارف" میں محترم مولانا سعید الرحمان ندوی صاحب قبلہ کی کتاب "قرآن عظیم کی آفاقیت اور اس کا فلسفہ کائنات" سے اخذ کردہ سلسلہ وار مضامین کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے، اور اب اس کے حالیہ جولائی والے شمارے میں ان کا مکتوب عام بھی۔ نیز اس کتاب کا اب تک بقیہ غیر شائع شدہ حصہ بھی میں نے مکتوب ہذا میں فراہم کی گئی انٹرنیٹ لنک پر انگریزی میں دیکھ لیا ہے۔

یقیناً جدید فلکیات کائنات میں خارجی زمینوں اور خارجی مخلوقات کی بہتات کے ضمن میں کافی پیش رفت حاصل کر چکی ہے۔ پچھلے سال امریکی خلائی ادارہ ناسا کی جانب سے خلا میں بھیجے گئے کیپلر مشن کی تازہ دریافتوں سے بھی یہ حقیقت مزید مستحکم ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر میں سینکڑوں سائنسی رصدگاہیں اور ان میں ہزاروں سائنس داں پچھلی نصف صدی سے مسلسل خارجی مخلوقات کی کھوج اور ان سے ربط و تعلق قائم کرنے میں سرگرداں ہیں، جس پر مجموعی اعتبار سے سالانہ اربوں ڈالر کا خرچ آرہا ہے۔ مغربی سماج میں عوامی سطح پر بھی یہ موضوع کافی مقبول ہو چکا ہے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پچھلی دہائی میں اس موضوع پر معروف سائنس داں کارل ساگن اور اسٹیفن ہاکنس کی بعض مقبول عام کتابیں دو دو کروڑ کی تعداد میں بھی شائع ہو کر آناً فاناً فروخت ہو چکی ہیں۔

اس تعلق سے اہل مغرب کے نزدیک سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آگے چل کر اگر کوئی خارجی مخلوق عملاً دریافت ہو جائے۔ اور حالات سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ تو

اس کی ہماری موجودہ نسل انسانی کے لیے کیا اہمیت ہوگی اور ہم پر اس کے کیا عواقب ونتائج مرتب ہوں گے، کیوں کہ اس متوقع واقعہ کے نتیجہ میں مذہب کی حقیقت نئے امکانات کی متلاشی ہوگی۔ اس تعلق سے امریکی صدر اور پاپائے روم کی حالیہ ملاقات اور گفت وشنید بھی کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ذرائع کے مطابق اس اعلیٰ سطحی ملاقات کے دوران یہ طے کیا گیا ہے کہ خارجی مخلوق کی متوقع دریافت کے نتیجے میں عیسائیت کا ردعمل کیا ہونا چاہیے، اور اس کی ازسرنو تشریح کن خطوط پر کی جانی چاہیے۔ یعنی کل اہل مغرب نے متحد طور پر آنے والے علمی وفکری اور فلسفیانہ سیلاب کی روک تھام کے لیے پہلے ہی سے بند باندھنا شروع کردیا ہے۔ نتیجتاً ویٹ کن نے ابھی سے اس خارجی مخلوق کو اپنا خارجی بھائی کہنا شروع کردیا ہے۔

اس پس منظر میں مولانا محترم کی موجودہ کاوش اہل اسلام کے لیے یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوسکتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جس کام کے لیے ساری مغربی دنیا یک سو ہوکر بھی اپنے آپ کو بے سروسامان محسوس کرے اسے ہمارا ایک کم سن فرد واحد نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے دے یہ جدید دور میں صرف کتاب خداوندی ہی کا معجزہ ہوسکتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اس اربوں سالہ قدیم اور کھربوں سورجوں اور اس کی ماتحت لاتعداد زمینوں پر مشتمل کائنات کی ایک جامع توجیہ کرنے والی ہے، جو علم جدید سے بھی ہر طرح میل کھانے والی نظر آرہی ہے۔ چنانچہ جدید فلکیات کو جواب تک خارج از زمین ایک مردہ جرثومۂ حیات تک کھوج نہیں سکی ہے اس کو اس کتاب سے نہایت گہرے اور بڑے بصیرت انگیز حقائق ومعارف حاصل ہوسکتے ہیں۔

میں مصنف کتاب سے التماس کرتا ہوں کہ جب انہوں نے یہ پوری کتاب انگریزی میں عوامی استفادہ کے لیے انٹرنیٹ پر مفت فراہم کردی ہے تو وہ اس سلسلے کے بقیہ مباحث بھی ماہنامہ ''معارف'' میں شائع کرادیں تاکہ امت اس کے دیگر مباحث پر غور وخوض کرکے کسی خاطر خواہ نتیجہ پر پہنچ سکے۔

والسلام

ڈاکٹر صالح شریف

ترکی اور اردو کے مشترک الفاظ

حسن پور، ۲۴۴۲۴۱،
(جیوتی با پھولے نگر) یوپی۔
۲۸/اپریل ۲۰۱۰ء

بخدمت جناب ڈائریکٹر/سکریٹری دارالمصنفین۔اعظم گڈھ (یوپی)

جناب عالی!

میں آپ کا دھیان اپنی کتاب ''ترکی اور اردو زبان کے مشترک الفاظ''☆ کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔ جو ۵۵۸ صفحات پر مشتمل ہے، چمک دار اور مضبوط کاغذ پر چھپی ہے، اسے آئی ایس بی این ملا ہے، اور میری چھ سال کی سخت محنت و ترکی زبان کی میری زبان کی جان کاری جو میں نے حکومت ہند کے وظیفہ پر رہ کر حاصل کی تھی کا نتیجہ ہے۔

کتاب میں تقریباً ۹۰۰۰/ ہزار ترکی اردو زبان کے مشترک الفاظ کو یکجا کیا گیا ہے، اور اس میں اردو زبان کے ارتقاء، ترکی زبان کے سابقہ اور حالیہ حروف تہجی، عثمانی ترکی زبان کے نمونے، موجودہ رائج ترکی زبان کے حروف تہجی کے بارے میں معلومات اور ضابطہ حسن Law of Euphony یا ضابطہ مطابقت Law of Assamilation جس سے ترکی زبان کے حروف ترتیب دیے جاتے ہیں تحریر کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان مشترک الفاظ کو ترکی اور اردو زبانوں میں لکھنے کے علاوہ ان الفاظ کے معنی دونوں زبانوں میں تحریر کردیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے انگریزی اور ترکی زبانوں کے دیباچے Forewords اس وقت کے ترکی سفیر جناب خلیل آکنجی صاحب نے تحریر کیے ہیں اور اردو پیش لفظ اردو زبان کے مشہور ادیب اور ناقد، دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر، وانڈین کلچرل سینٹر تاشقند (ازبکستان) کے سابق ڈائریکٹر مرحوم پروفیسر قمر رئیس صاحب کا تحریر کردہ ہے۔

ادبی حلقوں میں کتاب کی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ مشہور صحافی جناب خوشونت سنگھ نے اسے A Most Valuable Referance Book یعنی ''حوالہ کی ایک سب سے زیادہ قیمتی کتاب'' کہا ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری جناب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے اسے ''غیر معمولی لسانی اور

☆ اس قابل قدر کتاب پر معارف فروری ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۷ پر تبصرہ آچکا ہے۔ (معارف)

علمی کام'' سے تعبیر کیا ہے۔ ترکی سے شائع ہونے والے ترکی زبان کے اخبار Zaman نے ۲۷/ مارچ ۲۰۰۷ء کو میرے فوٹو کو ساتھ کتاب کے بارے میں ایک کالم شائع کیا تھا اور ترکی سے ہی شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار Today's Zaman نے اپنی ۲۹/ مارچ ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں کتاب سے متعلق خبر چھاپی تھی۔ علاوہ ازیں Google نے اپنی انگریزی اور ترکی Websites پر کتاب کے بارے میں Display کیا تھا اور Internet پر کتاب کے بارے میں اب مندرجہ ذیل Websites پر دیکھا جا سکتا ہے:

Google.com, Bookfinder.com, Worldcat(Beta), Allbookstores, Bestbookbuys, www.universitylibraries.com(University of Washington), www.yahoo.com

نیازمند اصغر حمید ایڈوکیٹ

مطلقہ عورت کا نان ونفقہ

موضع سیوری، پوسٹ منجھول،
بیگوسرائے، بہار۔
۲۰۱۰/۵/۷ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

میں نے آپ کی کتاب ''مطلقہ عورت اور نان ونفقہ'' دوبار منگائی۔ پہلی بار تو کتاب ہاتھ لگاتے ہی اپنی بوسیدگی کے سبب پھٹ گئی جس کا بے حد قلق ہوا۔ پھر دوسری بار منگائی تو کہانی ایک ہی تھی لیکن سابقہ کتاب سے کچھ اچھی حالت میں تھی۔ بوسیدگی کا گلہ ''معارف'' اپریل کے اداریے سے جاتا رہا۔

کتاب اپنے اسلوب، محتویات اور ابعاد کے لحاظ سے وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جسے ہر تعلیم یافتہ مسلم گھر میں ہونا چاہیے۔

کیا اس کا ہندی ترجمہ بھی ہے؟ اگر ہو تو بتائیں، کیونکہ میں ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں کی غالب آبادی ہندو اور ہندی دانوں کی ہے۔ طالب دعا (جناب) راجو خان

ادبیات

غزل

جناب وارث ریاضی

اٹھایا ہے خوشی سے عشق کا بارگراں میں نے
محبت میں نہیں سوچا کبھی سود و زیاں میں نے

تری بخشی ہوئی حکمت کا یہ اعجاز ہے یارب!
کہ آسانی سے کی سیر فراز کہکشاں میں نے

دیا ہے درس علم و آگہی کا نوعِ انساں کو
کیے ہیں منکشف اسرار بزم دو جہاں میں نے

جنوں کو آگہی دی ، عقل کو وارفتگی بخشی
محبت کو عطا کر دی حیات جاوداں میں نے

مری تسبیح کے دانے ہیں زُنّاروں سے پیوستہ
جبینِ کفر پر دیکھا ہے سجدوں کا نشاں میں نے

سبق دے کر چمن والوں کو کانٹوں سے محبت کا
بدل ڈالا ہے فرسودہ نظام گلستاں میں نے

الٰہی ! کس طرح میں ناصحِ مشفق کو سمجھاؤں
بہت کچھ کھو کے حاصل کی ہیں یہ رسوائیاں میں نے

گریں گی بجلیاں میرے نشیمن پر، اسی ڈر سے
اجاڑا ہے ہزاروں بار اپنا آشیاں میں نے

وہ تھی قلب پریشاں میں دھڑکنے کی صدا وارث
جسے سمجھا تھا آواز رحیلِ کارواں میں نے

کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، پوسٹ بسُوریا، وایا لَوریا، مغربی چمپارن۔ بہار (۸۴۵۴۵۳)۔

مطبوعات جدیدہ

اقبال ، شاعر رنگیں نوا: از پروفیسر عبدالحق ، متوسط تقطیع ، بہترین کاغذ و طباعت ، مجلد ، صفحات ۲۱۶ ، قیمت: ۴۰۰ روپے ، پتہ: پروفیسر عبدالحق ۲۳۱۵ ، ہڈسن لائن ، کنگس وے کیمپ ، دہلی ۱۱۰۰۰۹۔

علامہ اقبال کا مطالعہ و مذاکرہ اور تاثر و تجزیہ فاضل مصنف کی تحقیقی کاوشوں کی بنیاد بھی ہے اور معراج بھی ، آفاق اقبال میں گم ہوکر سیر آفاق کی وہ ایک مثال ہیں ، ان کی تصنیفات کی تعداد سات ہے اور اس سبع سیارگان میں پانچ کا تعلق فلک اقبال سے ہے اور اسی سے ہمارے تاثر کی تصدیق ہو جاتی ہے ، زیر نظر کتاب میں ان کے وہ پندرہ مقالات و مضامین ہیں جو اقبال کی تفہیم و تبلیغ کے لیے مختلف علمی مجلسوں میں پیش کیے گئے ، یقیناً اقبال کی شاعری حیرت و مسرت اور غیر معمولی بصریت سے معمور وہ کشکول ہے جو ان جیسے مرد قلندر کو ہی زیبا ہے ، کیا خوب کہا گیا کہ یہ جاں طلب ہے اور جاں بخش بھی ، یہ سلسلہ داد و ستد اب تک جاری و برقرار ہے تو یہ شعر اقبال کی اقبال مندی و کرامت ہی ہے۔ فاضل مصنف کو مطالعہ اقبال کی مختلف اور متنوع تعبیروں نے سرشار کیا اور ان کی حیرتوں میں اضافہ کیا اور اس حد تک کہ ان کی شخصیت اور تحریر خود اقبال کے مطلوب مرد مومن کی نہایت دلکش تصویر نظر آتی ہے ، مطالعہ اقبال میں کئی جہتیں ایسی ہیں جن کی تعبیر و تفسیر کی جاتی رہی ہے ، مثلاً رومی ، حالی ، شاہین ، جہاد ، ہندی فکر و فلسفہ ، بیداری اقوام اور بیسویں صدی کے افکار نو وغیرہ ، یہ مباحث اس کتاب میں بھی ہیں لیکن قلب و نظر کی اصابت اور جذبہ و فکر کے جادۂ مستقیم کی ہدایت نے جو روشنیاں بکھیری ہیں ان کی تجلی واقعی سرمہ بصیرت کا سبب بن جاتی ہے ، ایشیائی بیداری کے تعلق سے اقبال کے کلام و پیام کی صداقت ، سچ ہے کہ زمان و مکان کے طلسم کو خاطر میں نہیں لاتی ، اس طلسم خانہ کی سیر جس طرح کی گئی ہے اور مغربی نظام و تہذیب کے ساحرانہ فریب کی حقیقت عیاں کر کے اشتراکیت ، مصطفیٰ کمال کی ترکیت اور سرزمین دجلہ و فرات و جیحون و سیحون اور ملت افغان کی امامت اور اس کی ضرب کاری اور آتش چنار کی حرارت کو لیے کشمیر کی خاک ارجمند تک کی تفسیر جس حسن و نفاست سے کی گئی ہے وہ یقیناً

لامکاں کے لیے سنبھال کر رکھے گئے نغمہ جبرئیل کی صدا بندی کی بہترین مثال ہے، ایک اور مضمون، اللہ نور السماوات والارض کے تعلق سے اقبال کے فلسفہ خودی کے بیان میں ہے اور اس دعوی کے ساتھ ہے کہ اقبال نے اپنے افکار کو جلا اسی آیت کی مدد سے دی ہے، اقبال اور رومی کا رشتہ کوئی راز سربستہ نہیں لیکن یہ کہنے کا حق، مرد حق کو حاصل ہوا کہ دنیائے ادب میں ایک عظیم شاعر کا اپنے تمام اکتسابات کو دوسرے شاعر سے منسوب کر کے عجز کا اظہار، اقبال کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے کے حصے میں آیا ہو، برصغیر میں رومی شناسی کی بات آئی تو فاضل مصنف کو معاً شبلی کی یاد آئی کہ اس روایت کی طرح ان ہی کی ڈالی ہوئی ہے، ارتفاع فکر ہی ہے کہ اقبال کے ساتھ مصنف کے دوسرے ممدوح اعظم علامہ شبلی کا ذکر جا بجا آ ہی جاتا ہے، بیسویں صدی کے فکری تضادات کے تجزیے میں یہ جملے آگئے ہیں کہ ''انگریزوں کے خلاف مولانا شبلی کی پہلی جنوں خیز انقلابی آواز کو ہم بھول بیٹھے''، ''علامہ شبلی کو ماضی پرستی کی عینک سے دیکھا گیا اور ان کے اجتہادی اور استقبال شناس فکر سے چشم پوشی کی گئی''، شبلی کے معاصر اور منفرد انشا پرداز، محمد حسین آزاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا دامن قومی بے وفائی سے آلودہ تھا عین اس وقت علامہ شبلی نے ع تازگی بدرو حنین از تو ہست کہنے کی جرأت کی تھی، اقبال کو سمجھنے کے لیے یہ تاریخی اشارے ناگزیر ہیں، حالی بھی ایسا ہی ایک اشاریہ ہیں جس کی بہترین تفصیل ''حالی پیش رو اقبال''، میں آگئی ہے، یہاں بھی شبلی کی یاد آگئی کہ ع شعر اگر دامن دل می نکشد بانگ خراست

کہہ کہ فاضل مصنف کے بقول ''صحف سماوی کی یاد دلائی'' (ان انکر الاصوات لصوت الحمیر) مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل کا ذکر ہوتا رہتا ہے لیکن آزاد بھارت کے پہلے اقبال شناس کی حیثیت سے عبدالسلام شناسی، نگاہ حق کے ذریعہ ہوئی یہ جملہ پر لطف ہے کہ ''اگر مولانا عبدالسلام، ندوی کی جگہ قاسمی ہوتے تو شاید کبھی بھی اس حوصلہ مندی کا ثبوت نہ دے پاتے، مولانا دریابادی کے متعلق یہ کہنا بجا ہے کہ اگر وقت نکالتے تو اقبال کے فکر و فلسفہ پر ایک رہنما تحریر سامنے آتی، لیکن مولانا نے جو بھی لکھا وہ اختصار کے باوجود نہایت اہم ہے، اس موضوع پر وقیع کام کی ضرورت ہے، مضامین اور بھی ہیں اور سب اقبال کی معجز نمائی اور خود صاحب کتاب کے افکار کی شادابی اور اسلوب کی دلفریبی کی وجہ سے بار بار پڑھنے کے لائق ہیں، البتہ کتابت کے

تسامحات سے یہ کتاب بھی محفوظ نہیں، سورۂ یونس کی آیت وما کان الناس الا امة واحدة ہے، کل امة واحدہ نہیں ہے، اسی طرح مثال کے معنی میں تمثال کے استعمال کا جواز مشکل ہے۔معنوی کی طرح کتابت کی ظاہری قیمت بھی زیادہ ہے۔

شبلی کالج کا مایہ ناز فرزند کبیر احمد جائسی : مرتب ڈاکٹر شہاب الدین،

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۰۰، قیمت : ۲۵۰/روپے، پتہ :

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

جناب جائسی اردو ادب کے لیے محتاج تعارف نہیں اور اس سے زیادہ فارسی ادبیات کے تعلق سے ان کی شہرت ہے اور شہرت بھی ایسی جو اصل اور بنیاد پر استوار ہے، سہاروں اور مصنوعی ذریعوں سے بے نیاز، دو درجن سے زیادہ تصنیفات وتالیفات سے اردو کے دامن کو ثروت بخشنے والی اس شخصیت کی شہرت کو پر پرواز اسی وقت مل گئے تھے جب انہوں نے نصف صدی قبل شبلی کالج سے مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں میگزین کو مرتب کیا تھا، نوعمری میں یعنی جب وہ انٹر کے طالب علم تھے اس وقت ان کی شیریں دیوانگی اور ذوق جنوں کی بات چل نکلی تھی، زمانے نے قول کو حقیقت میں جس طرح بدلا، یہ کتاب اسی کا پر لطف بیان ہے کہ ''پایان عمر میں علم واکتساب کی پختگی نے رخ ورخسار کو ہی نہیں پوری شبیہ کو طلوع صبح مشرق کی تابانی بخش دی''، قریب پندرہ نامور معاصرین، احباب اور تلامذہ کے مطالعات وتاثرات اس مرقع میں لائق مرتب وشاگرد نے ہر رنگ ومنظر سمیٹنے کا لائق تحسین کام اس لیے کیا کہ علامہ شبلی کی ایک یادگار نے جن کو نامور کیا ان میں جائسی صاحب نمایاں ہیں بلکہ لائق مرتب کے خیال میں ادبیات کے میدان میں ایسا امتیاز شبلی کالج کے کسی اولڈ بوائے کے حصے میں نہیں آیا، مقصد بھی واضح ہے کہ یہ تذکرہ مشرقی یوپی کی اس درس ودانش گاہ قدیم کے موجودہ طلبہ کے لیے درس عمل ثابت ہو، زمانہ طالب علمی میں طالب علم کی اٹھان ایسی ہو کہ اس کے استاد اس کے سرمایہ امید بننے کی توقع اور تمنا کریں اصلاً یہ علم وتحقیق کی وجاہت، درس وتدریس کے ادائے امانت اور محسن اساتذہ سے عقیدت کا اعتراف ہے، مولانا عبدالسلام ندوی سے جائسی صاحب کی عقیدت ومحبت کی برکت ہے کہ ان کو لائق مولف کی شکل میں جزاء الاحسان کی نعمت دنیا ہی میں مل گئی۔

مطالعات و مشاہدات: از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت: ۲۵۰/روپے، پتہ: مکتبہ دارالمصنّفین کے علاوہ ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، رحمت نگر، اعظم گڈہ۔

اس کتاب کے مصنف اب اردو دنیا میں بخوبی متعارف ہیں، علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کے متعلق ان کی تحریروں نے اہل نظر سے داد حاصل کی اور اسی شغف کا اثر یہ ہے کہ ان کو تذکرہ نگاری کا خاص ذوق ودیعت ہوا، اس سے پہلے 'عظمت کے نشاں' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ مضامین چھپ چکا ہے، زیر نظر کتاب میں انہوں نے شاہ ولی اللہ سے حکیم عزیز الرحمان تک اٹھائیس شخصیتوں کا مطالعہ وتذکرہ تین جہتوں یعنی علمی وتنقیدی اور وفیاتی لحاظ سے پیش کیا ہے، ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ، مولانا حبیب الرحمان اعظمی، مولانا علی میاں، سید صباح الدین عبدالرحمان، ڈاکٹر حمید اللہ، سید نجیب اشرف، قاضی اطہر مبارک پوری جیسے مشاہیر کے ساتھ ابوعلی اثری، برق اعظمی، یحییٰ اعظمی، ڈاکٹر خلیل اعظمی، گیان چند گیان جیسے نسبتاً کم معروف لیکن نہایت معتبر اہل قلم کے حالات وخدمات سے شناسائی ہوتی ہے، نیک ناموں کو ضائع ہونے سے بچانے کا عمل ہمیشہ سے مستحسن رہا ہے، اس کتاب نے اسی پاکیزہ روایت کی بڑی خوبصورت توسیع کی ہے، کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ابوعلی اثری مرحوم نے ساری عمر دارالمصنّفین میں مصحح کی حیثیت سے بسر کرنے کے باوجود ہزاروں مضامین کا انبار لگا دیا اور جن کی انشاپردازی اور نفیس ادبی ذوق کا اعتراف مولانا دریابادی، ماہرالقادری اور خلیل الرحمان اعظمی جیسے مشاہیر ادب وتنقید نے کیا، رحمت الٰہی برق پختہ اور قادرالکلام شاعر اپنے دور میں صف اول کے کسی شاعر سے کم نہیں تھے لیکن مزاج وافتاد نے ان کو شہرت کی بلندیوں سے پرے رکھا، اس کتاب کے ذریعہ ان کی خدمات کو بہرحال زندگی ملی ہے، ڈاکٹر نعیم صدیقی اور شمس بدایونی کی افتتاحی تحریریں بھی یہی گواہی دیتی ہیں کہ یہ ایسا گلدستہ ہے جس سے روح، ذوق، دماغ اور قلب کو روشنی اور بصیرت حاصل ہوتی رہے گی۔

اردو میں حج کے سفرنامے: از ڈاکٹر محمد شہاب الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۲۸، قیمت: ۲۹۵/روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، ممبئی اور علی گڑھ، پٹنہ، دربھنگہ کے مشہور مکتبے۔

دوسری زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی سیر وسیاحت کے بیان میں قارئین کے لیے

دلچسپی اور افادیت کا سامان ہے اور اسی لیے اس کو ایک مقبول صنف کی حیثیت حاصل ہے اور اگر سفر، حج کا ہو تو مشاہدات کے علاوہ کیفیات کا امتزاج، دیدۂ و دل کے لیے سرمہ و سرمایہ کی متاع بے بہا کا سبب بھی بن جاتا ہے، اردو میں سفرنامے کم نہیں اور اللہ کے گھر اور اس کے رسولؐ کے شہر کے دیدار سے شرف یاب ہونے والے کن مقامات سے گذرے اس کی روداد یں بھی خوب ہیں لیکن اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار معلوم ہوا کہ حج کے سفرناموں کی تعداد خوب سے خوب تر یعنی قریب چار سو کے ہے، ان سفرناموں کی تلاش، تعارف اور ان کی علمی، فنی اور ادبی شان کی پہچان، آسان نہیں لیکن نوجوان اور ہونہار مولف کا ذوق تحقیق اور شوق جستجو واقعی قدر و تحسین و تبریک کے لائق ہے کہ انہوں نے کئی سال کی سخت محنت کے بعد یہ کارنامہ انجام دیا اور اس سلیقے سے کہ سطر سطر، حرف آفریں کو آواز دیتی ہے، انہوں نے پانچ ابواب میں سفرنامے اور پھر حج نامے کی بابت، تعریف، بنیادی عناصر، خصوصیات بیان کرنے کے بعد ان حج ناموں کو انیسویں اور بیسویں صدی کے تین مراحل میں شامل کیا اور ہر مرحلہ و عہد کے ممتاز حج ناموں کا تفصیل سے تجزیاتی مطالعہ پیش کر دیا، ایک باب میں ان حج ناموں کا جائزہ ہے جو اردو دنیا میں ترجمے کے ذریعہ متعارف ہوئے، اس طرح کتاب حقیقتاً عطر مجموعہ ہوگئی ہے اور معلومات کے لحاظ سے کہنا چاہیے کہ ایسی کارآمد کتاب اپنے موضوع پر اس سے پہلے نہیں لکھی گئی، کتاب کی تکمیل کے دوران یا بعد جن کتابوں کا صرف علم ہوا اور ان تک رسائی نہیں ہوئی ان کی بھی ایک خاصی وقیع فہرست بطور ضمیمہ شامل کر دی گئی، اس طرح یہ کتاب اس موضوع پر بحث و تحقیق کے طلبہ کے لیے بھی راہنما ہے، مذہبی ادب اور خصوصاً ارض شوق و عشق میں لبیک کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے کی آرزو رکھنے والوں کے لیے تو یہ خیر الزاد ہے۔

ذکر شہباز: ازمولانا محمد اسماعیل فلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۲۴، قیمت: ۱۸۰/ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور حرمین بک ڈپو، کچہری روڈ لکھنؤ و مکتبہ اسلام و مکتبہ الفرقان لکھنؤ۔

قریب آٹھ سال پہلے مولانا شہباز اصلاحی کے انتقال کی جب خبر آئی تو کم لوگوں کو معلوم تھا کہ علم و تحقیق، درس و تدریس، جذبہ و عمل اور اعتدال و توازن کا آسمان حقیقتاً ایک شہباز کی بلندی پرواز سے خالی ہوگیا، وہ مدرسۃ الاصلاح میں مولانا اختر احسن اصلاحی جیسے باکمال عالم مدرس کے ایسے

شاگرد تھے کہ دانش گاہ فراہی کے گل سرسبد کہلائے، نام کی معنویت کا اثر تھا کہ کسی ایک فضا کے لیے وہ محدود نہیں رہے، جامعۃ الفلاح، جامعہ اسلامیہ بھٹکل اور پھر دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کے علم و فضل کا فیضان جاری رہا، نظریاتی اعتبار سے وہ جماعت اسلامی سے قریب تھے لیکن یہ سلامتی طبع تھی کہ وہ خانقاہوں سے دور نہیں ہوئے، عمل کی قبولیت، صفائے دل پر منحصر ہے، اس کا وہ بہترین عملی نمونہ تھے، غیر معمولی علم نے ان کو شاخ ثمر بار کی طرح تواضع اور فروتنی کا نمونہ بنا دیا، ایسی قابل رشک شخصیتوں کی زندگی کا مطالعہ یقیناً نفع بخش ہے، اس کتاب کے لائق مصنف کی سعادت مندی ہے کہ انہوں نے مولانا مرحوم کے متعلق ان کے احباب و تلامذہ کے تاثرات کو سلیقے سے یکجا کر کے حق شاگردی و نیاز مندی ادا کر دیا، مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کے مضامین کے علاوہ ان کے عقیدت مند فیض یافتہ شاگردوں میں مولانا امین الدین شجاع الدین، ڈاکٹر اکرم ندوی، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی وغیرہ کے مضامین بہت وقیع ہیں، عبدالمتین منیری بھٹکلی نے بھٹکل میں مولانائے مرحوم کے قیام کی بڑی دلکش تصویر پیش کی ہے، ایک عنوان کے تحت خاص طور سے ذکر کیا گیا کہ مولانائے مرحوم کے احسانات کو اہل بھٹکل فراموش نہیں کر سکتے، مولانا کے خطوط اور ان کی بعض تحریروں کا انتخاب بھی ہے، ان کے نام میاں طفیل محمد، افضل حسین، مولانا جلیل احسن ندوی اور قاری علی محمد کے چند خطوط بھی ہیں، ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ ''شہباز کا استعارہ اچھے حوصلہ مند مومن کے لیے بعض صوفیہ کے ہاں ملتا ہے، حضرت یحییٰ منیری کے متعلق خواجہ نظام الدین کا یہ جملہ مشہور ہے کہ شہباز بست و لے نصیب ما نیست، خوشی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ وہ ہمارے ادب کے نصیب میں آگئے۔

نقوش فکر و عمل: از مولانا امین الدین شجاع الدین، مرتبہ مولوی محمد ارشد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۲۰، قیمت: ۱۲۰/ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلما لکھنؤ اور لکھنؤ، سہارن پور کے دیگر مکتبے۔

تعمیر حیات و بانگ درا کے مضامین کے ذریعہ جناب امین الدین شجاع الدین کی امانت قلم اور شجاعت قلب و ذہن کا اثر قائم ہوا، ان کے اداریوں نے خاص طور پر اہل نظر سے داد حاصل کی کہ فکر اور جذبہ کی اصابت و صلابت کے ساتھ ان کا اسلوب بڑا شگفتہ، شائستہ اور شستہ ہے، ان تحریروں کا لطف محض وقتی نہ رہے، افادیت تادیر رہے اس مقصد سے ان کی تحریروں کو اس کتاب

میں یکجا کر کے امر مستحسن انجام دیا گیا ہے، ان کے اساتذہ اور ندوے کے بزرگوں کی تحسین کچھ کم نہیں لیکن پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ان مضامین کا مطالعہ نہ کیا جاتا تو ایک عالم و دانش ور کی بصیرت افروز نکتہ آفرینی اور دینی حمیت سے ناواقفیت کا افسوس رہتا، یقیناً یہ مضامین ماہ وسال کی بندشوں سے ماوراء ہیں، ان کی پذیرائی ہونا چاہیے۔

فروغ نوا: از جناب رئیس احمد نعمانی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت: ۸۰/روپے، پتہ: محمد مرشد نعمانی D-9 عمادالملک روڈ (ٹنکی والی مسجد) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اور ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

حمد و مناجات اور نعت پاک وسلام وقصیدہ کا یہ مبارک مجموعہ واقعی رئیس الکلام ہے، جناب رئیس ادب وشعر میں اسلامی غیرت اور فہم توحید میں غیر معمولی حمیت کے لیے معروف ہیں، رسول اللہ ﷺ سے محبت کا منطقی نتیجہ آپ ﷺ کی اطاعت وپیروی ہے اسی لیے ہر لمحہ ہمارے شاعر کو احتیاط اور ہوش کا یہ احساس رہتا ہے کہ عظمت مصطفیٰ ﷺ کے نام سے جس نعت ووصف میں شرک کی آمیزش ہو وہ قطعی قابل قبول نہیں، ان کی شاعری میں یہی خوبی ہے کہ عشق، عاشق، تو، تیرا جیسے الفاظ نہیں، عبدہ ورسولہ کا استحضار ہمہ وقت ہے، جانتے ہیں کہ نعت گوئی میں زور طبیعت سب کچھ نہیں اس کے باوجود اشعار کیفیت سے خالی نہیں ؎

دریا، دریا، خشکی، خشکی ہوتی ہے مدحت پیارے نبیؐ کی
آپؐ آئے تو رونق آئی دنیا تو پہلے بھی بسی تھی
دیکھی ہو تو کوئی بتائے صورت ایسی! سیرت ایسی

حرف ناگزیر کے تحت انہوں نے ابتداء میں گفتگو کی ہے اس میں چند مقامات ایسے ضرور ہیں جہاں لہجہ، اعتدال کا طالب ہے، چند روایتی اشعار کی بنیاد پر اقبال کو نام نہاد شاعر اسلام کہنا اور ان کے لیے ڈھٹائی کا لفظ استعمال کرنا، معلم اخلاقؐ کے شیدائی کے لیے کہاں تک زیبا ہے، مدحت طیبہ کا اثر معلوم ہے کہ

جہاں نگاہ میں کانٹا بھی پھول ہوجائے

بہرحال اس دعا پر آمین ہے کہ ع مرے قلم کی خدا زندگی دراز کرے۔ ع-ص

نوٹ: ''شبلی کالج کا مایہ ناز فرزند کبیر احمد جائسی'' کے مرتب ڈاکٹر شباب الدین ہیں۔